کرشن چندر

وزیروں کا کلب

وزیروں کا کلب

کرشن چندر

مکتبہ شعر و ادب، سمن آباد، لاہور

ناشر . . . . تواز
مطبع . . . . معظم پرنٹرز لاہور
قیمت . . . . -/۱۲ روپے

فہرس

وزیر دل کا کلب	۵
دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی	۲۲
بلی اور وزیر	۳۲
تیتی پنکھا	۵۰
اشوک کی موت	۰
دال کسی کا دوست نہیں	۸۲
پرتیو	۱۰۰
کالو تجنجگ	۱۱۹
ایرانی پلاؤ	۱۲۵

وزیروں کا کلب

کناٹ پیلس کے گول چکر کے باہر ایک اور گول چکر تنزا بھیوں کی دوکانوں کا کھنچا ہوا ہے۔ یہ دوکانیں زیادہ تر کھوکھے کی لکڑیوں، ٹین کی چھتوں یا تریال کی دیواروں سے تیار کی گئی ہیں۔ ان میں سے بیشتر دوکانیں ڈھابہ نما ہوٹلوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ سرکاری معاملات کے سلسلے میں عام لوگوں کو اکثر سرکاری دفتروں میں جانا پڑتا ہے۔ یہ لوگ طبعاً کمینے اور عادتاً غلیظ ہوتے ہیں اس لئے نئی دلّی کے صاف ستھرے ہوٹلوں کا کھانا پسند نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں یہ لوگ انتہائی کنجوس اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔ ماڈی لارڈ اور کلفش ایسے ہوٹلوں کے بڑے بل دیکھ کر ڈر جاتے ہیں اس لئے ان لوگوں کی ضرورت کو مدِّ نظر رکھ کر کناٹ پیلس کے چکر کے باہر یہ دوکانیں جنگلی جھاڑیوں کی طرح گویا خود بخود زمین سے اُگ آئی ہیں یا ان دوکانوں میں آپ وہی بے ترتیبی، ابتری اور بدنظمی پائیں گے جو خودرَو جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ میں ہوتی ہے۔ مجھے ان ڈھابہ نما ہوٹلوں سے سخت نفرت ہے جہاں تین آنے میں دو چپاتیاں مل جاتی ہیں اور دال مفت، پانی مفت اور بیٹھنے کے لئے کرسی اور میز تک مفت۔ اگر غیر ملکی سیاح نئی دلّی کے ان غلیظ ڈھابوں کو دیکھ پائیں تو ہندوستان کے متعلق کیسی رائے قائم کریں! اور آج کل لے دے

کہ اپنے وطن میں اپنی ایک خارجہ پالیسی ہی تو رہ گئی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کا نام دوسرے ملکوں میں عزت سے لیا جاتا ہے ورنہ ہمارے ہاں ہے کیا ؟ — عوام ہیں تو جاہل، دوکاندار ہیں تو بے ایمان، کلرک ہیں تو رشوت خور، مزدور ہیں تو کام چور، عورتیں ہیں تو فیشن کی دلدادہ۔ لوگ ایسی بُری عادت کا شکار ہو چکے ہیں کہ غلیظ گھروں میں رہتے ہیں پھٹے کپڑے پہنتے ہیں اور گندے بازاروں میں آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ یہاں کسی غیر ملکی سیاح کو دکھانے کے لئے ہے کیا !— ——— ایک بھاکڑہ ننگل ڈیم ——— وہ مکمل ہی نہیں ہو چکتا۔ یار لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر اسے مکمل کر دیا گیا تو ہمارے پاس غیر ملکی سیاحوں کو دکھانے کے لئے رہ کیا جائے گا۔؟ ——— اور دوسری ہے ہماری خارجہ پالیسی ——— جس کی وجہ سے ہمارا بھرم باہر کے ملکوں میں قائم ہے۔ اور یہ خارجہ پالیسی گویا نئی دِتّی کی پیداوار ہے جہاں یہ بدصورت ڈھابے عین کناٹ پلیس کے سامنے موجود ہیں۔ جب تک یہ ڈھابے موجود ہیں، ہمارے ملک کی خارجہ پالیسی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی ——— میری ناچیز رائے میں تو اِن ڈھابوں کو ڈھا دینا چاہیئے ——— خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ آج کل جو کچھ میں کہتا ہوں اُس میں جملہ کم ہوتا ہے اور معترضہ زیادہ ہوتا ہے۔

میں اصل میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز کناٹ پلیس کے باہر ایک تپتی دوپہر میں ٹین کی چھت کے نیچے اسی ڈھابے میں بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا۔ مجھے یہ ڈھابے پسند نہیں، میں ادھر نہ ہی میں ان میں کھانا پسند کرتا ہوں، میں ایک شریف معقول اور پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ بڑے بڑے آدمیوں سے میری ملاقات رہتی ہے۔ جن میں وزیر، گورنر، لیڈر، مل اونر اور پنج سالہ پلان کے منیجر شامل ہیں۔ جی نہیں آپ نے نامناسب سمجھا۔ میں کسی محکمے میں ڈپٹی سکریٹری نہیں ہوں۔ سیمنٹ کا ٹھیکیدار

بھی نہیں ہوں، کسی وزیر کا بھانجہ بھی نہیں ہوں۔ نہیں نہیں، میری بیوی کسی پارلیمنٹ کی ممبر بھی نہیں ہے۔ میں تو آج کل ایک اخبار میں رپورٹر ہوں اور محض اس لئے اس ذلیل ڈھابے میں کھانا کھانے پر مجبور ہوں کہ مجھے تقریباً ہر روز سول سکریٹریٹ میں کسی نہ کسی بڑے آدمی کو انٹرویو کرنے کے لئے جانا پڑتا ہے اور میری جیب اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہائی لارڈ ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھاؤں۔ ورنہ ایمان کی کہئے پلش مخمل کی کرسیاں اور چیش شائر چینی کی پلیٹوں میں سجا ہوا کھانا کسے پسند نہ ہوگا؟ ہاں بھئی آدھی پلیٹ دال کی اور دے دو۔ اور یہ چپاتی تو بالکل جلی ہوئی ہے۔ اسے بدل کے لاؤ۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ اُفوہ کس قدر بُری عادت ہے میری۔ بے طرح بیکار کی باتیں کیا کرتا ہوں۔ اس سے ایک تو اصل مطلب فوت ہو جاتا ہے اور پھر وقت کتنا برباد ہوتا ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا۔ آپ آدھے گھنٹے سے ایک ہی لقمہ منہ میں ڈالے اُلّو کی طرح میرا منہ دیکھ رہے ہیں۔ نہیں نہیں، آپ خفا مت ہو جائیے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ کھانا بھی کھائیے اور ساتھ ہی میری باتیں بھی سنتے جائیے۔

ہاں تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ ایک روز تپتی دوپہر میں اسی ڈھابے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ــــــ ارے ذرا دیکھئے تو یہ کون آدمی آپ کے عقب میں آ کے بیٹھا ہے۔ مڑ کے دیکھئے۔ ارے دیکھئے ضرور مگر اس طرح تو نہ گھوریئے کہ دوسرا آدمی آپ کو سی آئی ڈی والا سمجھنے لگے۔ آپ نے اسے پہچانا؟ ذرا غور کیجئے۔ اپنے حافظے پر زور دے کر بتائیے آپ نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ مگر میں دعوے سے کہتا ہوں آپ نے اسے ضرور دیکھا ہوگا۔

کچھ یاد نہیں آتا؟ ــــ دراصل اس میں آپ کا بھی اتنا قصور نہیں

ہے۔ اس آدمی کی بڑھتی ہوئی مونچھیں جو اس کے لبوں پر گر رہی ہیں۔ اس آدمی کے میلے کچیلے کپڑے، یہ کھدر کی میلی غلیظ ٹوپی۔ اس کی پھیکی پھیکی تار تار مسکراہٹ سے آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ یہ آدمی کبھی اتر دکھنی پردیس میں وزیر زراعت تھا۔ نہ صرف وزیر زراعت بلکہ جیل کا محکمہ بھی اسی کے پاس تھا۔ اور میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ان دونوں محکموں کو سنبھالنے کا اہل بھی تھا۔ اس کا باپ موضع دھال پور کا مشہور زمیندار تھا۔ اور وزیر بننے سے پہلے یہ آدمی سترہ بار جیل جا چکا تھا۔ جن میں سے پہلی بار تو ایک اغوا کے کیس میں پکڑا گیا تھا۔ دوسری بار اس پر ڈاکوؤں کی امداد کرنے کا الزام تھا۔ تیسری بار چوتھی بار اس پر سرکاری مالیے سے غبن کا مقدمہ چلا، اس کے بعد جو قومی تحریک چلی تو اس آدمی کا کردار بالکل ہی بدل گیا۔ یہ غنڈے سے ایک نیک اور فرشتہ سیرت انسان بن گیا۔ آخری تیرہ جیلیں اس نے قومی تحریک کے سلسلے میں کاٹی ہیں۔

میں جماعتی تضاد میں بالکل یقین نہیں رکھتا۔ میں سمجھتا ہوں انسان کے اندر ایک نیک رُوح ہوتی ہے جسے اگر بیدار کر لیا جائے تو وہی انسان فرشتہ بن جاتا ہے۔ کوئی جماعت بُری نہیں ہوتی۔ کوئی انسان بُرا نہیں ہوتا۔ یہ سب دل میں تبدیلی پیدا کرنے کی بات ہے اور یہ بات الگ ہے کہ ہمارے ملک کے عوام جاہل ہیں۔ ان کے سر پر جب تک ڈنڈے نہ مارے جائیں وہ تبدیل نہیں ہوتے۔ اور ہماری آپ کی طرح شریف لوگ ہیں۔ ان کے لئے لیڈر کا اشارہ کافی ہے۔

یہ سابق وزیر آج کل بہت بری حالت میں دکھائی دیتا ہے۔ دیکھئے اس کی چپل کتنی گھسی ہوئی ہے۔ اور اس کا کھدر کا پائجامہ کیسا بوسیدہ ہو رہا ہے۔ اور اس کی مونچھیں لبوں کے لعاب سے متواتر گیلا ہو رہی ہیں۔

اس لئے ان کا رنگ کیسا اُجڑا اُجڑا سا ہے۔ جیسے مونچھیں بالوں کی نہ ہوں، جوٹ کی ہوں۔ میرے خیال میں تو اس سابق وزیر کو اپنی مونچھیں رنگوا لینی چاہئیں۔ ورنہ غیر ملکی سیاح ان مونچھوں کو دیکھ کر ہمارے ملک کی خارجہ پالیسی کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا۔

قسمت کی بات ہے صاحب کہ یہ وزیر آج کل اس بڑھاپے میں یوں معلوک الحال بیٹھا ہے۔ دراصل اس میں اس کی قسمت کو بھی اتنا دخل نہیں جتنا اس کی حماقت کو۔ اور سچ پوچھو تو دیانت داری بھی ایک طرح کی حماقت ہی ہے۔ یہ وزیر بے حد دیانت دار تھا اس لئے اس حال کو پہنچا۔ بھلا سیاست میں دیانت کا کیا دخل۔ سیاست میں تو دیانت نہیں دیکھی جاتی ایک دوسرے کا منہ دیکھا جاتا ہے۔ عوام یہ دیکھتے ہیں کہ لیڈر کیا کہتا ہے، لیڈر یہ دیکھتے ہیں کہ وزیر کیا کہتا ہے۔ وزیر یہ دیکھتے ہیں کہ چیف منسٹر کیا کہتا ہے، چیف منسٹر دیکھتا ہے کہ باہر کے ملک کیا کہتے ہیں۔ اسی پر بھارت کی ساکھ قائم ہے۔ تھوڑی سی چٹنی پیاز اور دینا۔

اس وزیر کا نام الگو رام رائے ہے جب یہ اتر دکھن پردیش میں وزیر تھا تو میں اس کا انٹرویو لینے گیا تھا۔ اس وقت اس کی شان ہی الگ تھی کھدّر کا سفید براق جامہ، سر پر کھدّر کی کشتی نما ٹوپی یوں اونچی تن کے کھڑی تھی جیسے کسی نے اس کے اندر بانس کی کھپچی ڈال کر کھڑا کیا ہو۔ یہی شبہ اس وزیر کی گردن پر بھی ہوتا تھا۔ اس زمانے میں جب میں اس سے انٹرویو لینے گیا تو اس کی اسٹینو بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کا قصہ الگ ہے وہ پھر سناؤں گا۔ اس وقت مجھے اس حسین نازک اندام سنہری گھومے ہوئے بالوں والی لڑکی کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی تھی۔ اونچی ایڑی والے سینڈل پہنے

ہوئے جب وہ ٹپ ٹپ کرتی ہوئی چلتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دفتر کے فرش پر ٹائپ کر رہی ہے۔ در اصل ہاتھوں سے زیادہ اس کے پاؤں ٹائپ کرتے معلوم ہوتے تھے اور جب وہ کلرکوں کی میزوں کے بیچ میں سے گذرتے ہوئے وزیر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ کر مسکراتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک متبسم ڈرافٹ کی مختلف کاربن کاپیاں فضا میں بکھیر رہی ہے۔

اس دن وزیر نے مجھے بہت لمبا انٹرویو دیا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ اسمبلی میں اس کا مشہور و معروف زرعی بل پیش ہونے والا تھا۔ وہ انٹرویو کے بیچ میں بار بار سگار پیتا تھا۔ ایک معطر رومال تہہ در تہہ ہاتھوں سے بنے ہوئے کھدر کا رومال جیب سے نکال کر اپنا منہ پونچھتا تھا۔ اور اس طرح دزدیدہ نگاہوں سے اپنی حسین سٹینو کو دیکھتا تھا جیسے اُن دونوں کے درمیان کوئی دلچسپ راز مشترک ہو اور وہ کافر ادا بھی یوں اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی جیسے اس نے اپنے لبوں کے پیچھے میں کسی نئی مسکراہٹ کا ربن فٹ کیا ہو۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔ ایک عورت اور ایک ٹائپ رائٹر میں کیا فرق ہے؟ ذرا گدگداؤ مسکراہٹ باہر!

نہیں صاحب میں عورت کا دشمن نہیں ہوں، میں قنوطی بھی نہیں ہوں میں عورتوں، ٹائپ رائٹروں، لیڈروں، وزیروں، سوشل ورکروں اور جناسیوک سماج کا بے حد معترف ہوں۔ لیکن مجھے اگر کسی سے گلہ ہے تو اپنے ملک کے جاہل عوام سے۔ میں کیا بتاؤں کہ کس قدر کوڑھ مغز ہیں یہ لوگ۔ اپنا بھلا بُرا سمجھنے کی توفیق بھی نہیں رکھتے۔ آپ خود ہی سوچیے۔ وزیر الگو رام نے جو زرعی بل اسمبلی میں پیش کیا تھا۔ وہ کس قدر انقلابی ذہنیت کا حامل تھا۔

اگر وہ پاس ہو جاتا تو اس سے ہمارے ملک کے عوام کو کتنا فائدہ پہنچتا۔ اور باہر کے ملک بھی اس بل کے پاس ہونے سے کس قدر خوش ہوتے۔ مگر جانے کیا بات ہوئی کسی کا دھیان ہی نہیں گیا اُس طرف۔ حالانکہ وزیر زراعت نے بہت عمدہ بل پیش کیا تھا۔ اور ان کی زرعی اصلاحات کا سارا مقصد یہ تھا کہ زمین کسانوں سے لے لی جائے اور زمینداروں میں بانٹ دی جائے۔

—— آپ کو سن کر تعجب کیوں ہو رہا ہے۔ بالکل یہی مقصد تھا اس زرعی بل کا۔ یعنی زمین کسانوں سے لے لی جائے اور زمینداروں میں بانٹ دی جائے ...... ! میں اس سلسلے میں وزیر زراعت سے انٹرویو لینے گیا تھا کیونکہ بات مجھے بھی ذرا سی عجیب لگی تھی کہ اس زمانے میں جب چاروں طرف سے یہ آواز اٹھ رہی ہے کہ زمین زمینداروں سے لے کر کسانوں میں بانٹ دی جائے۔ اس وقت ایک مَن چلا ایسا اٹھتا ہے جو بانگ دہل —— بانگ دہل آپ سمجھتے ہیں نا؟، نہیں تو گھر جا کے ڈکشنری دیکھئے گا۔ —— جو بانگ دہل اسمبلی میں یہ بل پیش کرتا ہے کہ زمین زمینداروں سے نہیں بلکہ کسانوں سے لے لی جائے اور زمینداروں میں بانٹ دی جائے۔ اس سلسلے میں جب میں نے وزیر زراعت الگورام رائے تریپاٹھی سے استفسار کیا تو اس نے مجھے ایسا شافی جواب دیا کہ طبیعت پر آج تک اس کا اثر باقی ہے۔

الگورام نے کہا۔ دیکھئے یہ بات کس قدر غلط ہے کہ پہلے تو ہم زمین زمینداروں سے لیتے ہیں اور اس طرح شرفا کے ایک طبقہ کو ختم کرتے ہیں۔ یہ طبقاتی نفرت ہمارے سرکاری دستور کے بالکل خلاف ہے۔ پھر ہم اس پر بس نہیں کرتے۔ ہم یہ زمین زمینداروں سے لیکر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کسانوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ زمین کی یہ ٹکڑے سازی ہماری زرعی پیداوار کو اور بھی کم کرا دیتی ہے

اور اس کے بعد جب ہمیں اس کا احساس ہونے لگتا ہے، تو ہم کوآپریٹو تحریک چلاتے ہیں۔ یعنی اُس زمین کو جو مختلف کسانوں میں ٹکڑے ٹکڑے کرکے بانٹی گئی تھی پھر سے اکٹھا کرتے ہیں۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ بھئی ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھر سے اکٹھا کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ زمین زمینداروں کے پاس رہے۔ زمینداری جو ہے وہ گویا ایک طرح کا کوآپریٹو سسٹم ہی تو ہے۔ میرے موضع دھال پور ہی کو لے لیجئے۔ یہ ہمارا اجدی ششتینی گاؤں ہے لیکن ہمارے موضع کے سارے کسان اس میں ہل کے ہل چلاتے ہیں، ہل کے بیج بوتے ہیں۔ فصل اٹھاتے ہیں، فصل کاٹتے ہیں۔ یہ کوآپریٹو تحریک نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ میرے والد خود اپنی آنکھوں کے سامنے سب کام کراتے تھے اور جو بدمعاش کسان چوری چکاری کرتا تھا اسے فوراً بے دخل کر دیتے تھے۔ آج کل عجیب حالت ہے۔ کسان کتنا ہی نکھٹو، کاہل اور کام چور کیوں نہ ہو، کوئی اسے اس کی زمین سے بے دخل نہیں کر سکتا۔ ہے حالانکہ میرے ایسے اعلیٰ پوزیشن کے وزیر سے روز جواب طلبی ہوتی رہتی ہے۔ تم نے اپنے بھائی کو فلاں جگہ پر کیوں تعینات کیا۔ اور اپنے فلاں بھتیجے کو فلاں پوسٹ کیوں دیدی۔ ایک وزیر کو کسی وقت بھی اس کی وزارت سے بے دخل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک معمولی ان پڑھ جاہل، مذہبی توہمات اور اندھے اعتقادات کے مارے ہوئے کسان کو کبھی اس کی زمین سے بے دخل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کوئی انصاف ہے؟

پھر دیکھئے۔ جب سے زمینداروں سے زمین چھینی جارہی ہے زرعی پیداوار کم ہوتی جارہی ہے، کسان پہلے سے زیادہ نکمّے اور کاہل ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اب ان کے سر پر زمیندار کا ڈنڈا نہیں ہے۔ نہ صرف زرعی پیداوار کم ہو گئی ہے بلکہ اناج کی قیمتیں بڑھتی جارہی ہیں۔ ایمان کی بات کہیے، دھرم کی بات

کہئے۔ ذرا بیس تیس برس بلکہ چالیس برس پہلے کے زمانے میں جائیے جب کہ کسانوں کی یہ غلط تحریک ہمارے ملک میں نہ چلی تھی۔ دیکھئے اس وقت بھی زمین زمینداروں کے پاس تھی لیکن ہمارا ملک کس قدر خوشحال تھا۔ ہمارے کسان کس قدر مزے سے رہتے تھے، اناج کس کثرت سے پیدا ہوتا تھا اور کتنا سستا بکتا تھا۔ چاول روپے کا سولہ سیر تو میں نے خود کھایا ہے۔ گندم روپے کی تیس سیر آتی تھی۔ شمٹی روپے کی سوامن بکتی تھی، تین آنے سیر دودھ تھا۔ گھی روپے کا چھ سیر بکتا تھا، آم روپے کا پندرہ سیر مل جاتا تھا۔ آج کل آم تو کیا لکڑی کا برادہ اس بھاؤ پر دستیاب نہیں ہوتا۔ اجی لکڑی کا برادہ تو کیا۔ اگر آپ اپنے مکان کی تعمیر کے لئے باہر سے ریت لانے جائیں تو وہ اس بھاؤ پر نہیں مل سکتی مجھے معلوم ہے میں آجکل ڈپلومیٹک انکلیو نئی دہلی میں اپنی کوٹھی تعمیر کرا رہا ہوں مجھے معلوم ہے ریت کس بھاؤ پر ملتی ہے۔ سیمنٹ تو خیر کوٹا سے مل جاتا ہے گورنمنٹ اگر ریت کا بھی کوٹا کر دے تو ممکن ہے کچھ بات بنے۔ مگر مرکزی حکومت کو اس کی فکر کیا ہے۔ کلچر کے لئے وزارت الگ بنا دی ہے۔ یہ کلچر وکلچر سب بکواس ہے۔ میرے خیال میں تو مرکز کو جلد سے جلد ریت کی وزارت کھول دینی چاہیئے۔ کب سے میری کوٹھی کا کام ریت کے نہ ہونے سے رکا پڑا ہے۔

تو اس لئے ریلوے صاحب الگورام رائے ترپاٹھی دھمال پوری وزیر زراعت اور جیل خانہ و بیڑ خانہ نے میری طرف اپنی کرنجی آنکھیں گھما کر کہا۔ اس لئے میں یہ نیا بل آج اسمبلی میں پیش کر رہا ہوں تاکہ زمین پھر سے زمینداروں کو مل جائے اور ملک میں اناج سستا ملنے لگ جائے اور ہمارے کسانوں کے لئے وہی خوشحالی کا دور آ جائے جو آج سے چالیس برس پہلے اس ملک میں تھا۔

«مہربیر» [illegible] نے پُر[illegible]ش انداز [illegible] تالی بجائی۔ وزیر کی تقر[illegible] امی مدلّل اور نئے فکر کی حامل تھی۔ [illegible] از اں اسمبلی میں جو اس نے تقریر کی [illegible] اس سے بھی بہتر تھی مگر عین موقع پر یہ سانحہ ہوا کہ چیف منسٹر جس نے [illegible] زراعت کو امداد کا یقین دلایا تھا عین وقت پر اسی چیف منسٹر کا گروپ الرآ[illegible] سے مل گیا۔ اور یہ بل پاس نہ ہو سکا۔ چیف منسٹر کو دوبارہ وزارت کی تشکیل کرنا پڑی۔ جس میں انہوں نے الگو رام ترپاٹھی کو نہ لیا۔ ترپاٹھی نے دلّی میں آ کے بہت سے دروازے کھٹکھٹائے۔ مرکزی حکومت سے کرم طلبانے کی بہت سی کوششیں کر ڈالیں مگر کوئی سعی بار آور نہ ہوئی۔ اس وزیر کا موضع دھمال پور بھی اس سے چھن گیا۔ گویا یہ آدمی اپنی وزارت سے گیا اور اپنے آبائی پیشے سے بھی گیا۔ اب آج آپ اسے اس ذلیل ڈھابے میں جلی ہوئی تندوری چپاتی کھاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں ——— ایسے میں اگر کوئی غیر ملکی سیّاح ہمارے سابق وزیر کو اس حالت میں دیکھ لے تو ہماری خارجہ پالیسی کے بارے میں کیا رائے قائم کرے؟

مگر اصل میں اس وزیر کا جو قصّہ میں آپ کو سنانے لگا تھا وہ تو بالکل ہی مختلف ہے۔ جی نہیں وہ شیتو گراز حسینہ کا قصہ بھی اس وقت نہیں سناؤں گا اُس کے لئے شام کا وقت بہتر ہو گا۔ جب بیئر کا سنہری کف آلود سیال شفاف جام میں جھلکتا ہو اور نہاں روشنیوں کا نور کسی کے سنہرے بالوں پر دمکتا ہو اور کوئی آہو چشم دلنواز میری بغل میں بیٹھا ہو اور بل آپ ادا کر رہے ہوں۔ وہ قصہ اس وقت سنانے کا نہیں ہے۔

اس وقت تو میں آپ کو اس وزیر کی دوسری ملاقات کا حال سناتا ہوں۔ جب الگو رام اپنی وزارت سے برطرف کر دیا گیا اور دلی پہونچا اور کوشش

کر کے بھی وزارت دوبارہ حاصل کرنے میں ناکام رہا تو اس نے نئی دہلی میں وزیروں کا کلب کھول دیا۔ جی ہاں وزیروں کا کلب اس نئی دلی میں۔ وہ جہاں آر میا ہوٹل ہے نا، اس کے بالکل سامنے کی بلڈنگ میں کھلا تھا۔ اس کلب کی داستان بھی بیحد دلچسپ ہے، میں ابھی آپ کو سناتا ہوں۔ ذرا میرے لئے آدھی پلیٹ مرغ کی آرڈر کیجئے، مگر خیال رہے کہ اس میں ایک ٹکڑا تو مرغ کی ٹانگ کا ہو، دوسرا ٹکڑا سینے کا ہو۔ مجھے مرغ کی ٹانگ اور اس کا سینہ بہت پسند ہے۔ کیا کہا آپ نے؟ مغرب میں عورت کو بھی اسی معیار سے پرکھا جاتا ہے۔ یعنی اس کے سینے سے اور ٹانگ سے؟ صاحب آپ نہایت عورت زدہ انسان معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے یہ ہندوستان ہے جس کا پڑوسی پاکستان ہے افغانستان ہے۔ مغرب کی غلاظت یہاں نہ بکھیرئے۔ ہم لوگ ایک روحانی خطے کے رہنے والے ہیں۔ مغرب کی مادیت یہاں نہیں چلے گی۔ جو مرغ اور عورت کو ایک ہی معیار سے پرکھتی ہے —— چلئے مرغ نہ سہی ساگ والا گوشت ہی منگا لیجئے۔

ہاں تو ایک روز میں اپنے اخبار کے دفتر میں بیٹھا ہوا پروف پڑھ رہا تھا کہ نائب مدیر نے ایک دعوتی رقعہ میرے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ کناٹ پیلس میں آج شام کے چھ بجے وزیروں کا کلب کھل رہا ہے آپ اس کی رپورٹ لے آیئے میں بڑا حیران ہوا، یہ وزیروں کا کلب کیا بلا ہے۔ کارڈ دیکھا، واقعی آج وزیروں کے کلب کا ادگھاٹن ہو رہا تھا۔ شری گدگدا چاریہ مرکزی وزارت کے سابق منسٹر اس کا افتتاح کر رہے تھے۔ وزیروں کا کلب؟ —— بات اچنبھے کی تھی۔ لیکن جب میں نے کارڈ کے نیچے سکریٹری کا نام پڑھا تو چونک اٹھا۔ نیچے جلی حروف میں لکھا تھا "آر۔ ایس۔ وی، پی، سکریٹری الگو رام رائے ترپاٹھی: دھمال پوری، سابق وزیر زراعت اُتری دکھن پردیس۔ رئیس زادہ دجیل یافتہ

ستر بار ـــــ) اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے اور افتتاح چھ بجے تھا۔ میں نے اسی وقت سائیکل اٹھایا اور وزیروں کے کلب میں پہنچ گیا۔

وزیروں کا کلب بہت عمدہ سجایا گیا تھا۔ دریاں، گاؤ تکیئے، تخت پوش دیوان، صوفے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا فرنیچر اور ٹوم انڈسٹری کی نمائش ہو رہی ہے۔ کاغذی پھولوں اور ربڑ کے رنگین غباروں سے سجے ہوئے مرکزی ہال کے ایک طرف نیرا بار تھا جہاں صرف نیرا وستیاب ہوتی تھی۔ تمباکو نوشی کے کمرے میں صرف بیڑی پی جا سکتی تھی۔ اور کھیلوں کے کمرے میں صرف شطرنج کھیلی جا سکتی تھی۔ الگورام مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔ اب کے وہ وزیروں کا لباس یعنی اچکن اور چوڑی دار پاجامہ نہیں پہنے ہوئے تھا۔ بلکہ کھدر کا ڈھیلا ڈھالا کرتا اور پائجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر پر گاندھی ٹوپی تو تھی۔ لیکن اس کا رنگ اب سرخ تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ میں نے اپنی پارٹی سے قطع تعلق کر لیا ہے اور اب سوشلسٹ پارٹی سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، اگر وہاں کامیاب نہ ہوا تو کیمونسٹ پارٹی میں جاؤں گا اور اگر وہاں کامیاب نہ ہوا تو اپنی پارٹی الگ بناؤں گا۔"

لیکن فی الحال تو میں نے وزیروں کا کلب کھول لیا ہے۔ جب مجھے وزارت سے الگ کیا گیا تو مجھ کو کوئی نہ کوئی کام تو ضرور کرنا تھا اس لئے سوچ سوچ کے میں نے نئی دلی میں وزیروں کا یہ کلب کھول دیا ہے۔ اس کا ہر وہ شخص ممبر ہو سکتا ہے جو کبھی مرکزی وزارت یا صوبائی وزارت میں وزیر نائب وزیر، ڈپٹی نائب وزیر، یا ڈپٹی نائب جوائنٹ وزیر رہ چکا ہو۔ مقصد اس کلب کا ہے سابق وزیروں کے حقوق کی حفاظت اور ان کی بحالی۔ میں کہتا ہوں اگر ہماری حکومت شرنارتھیوں کی بحالی کے لئے ایک وزارت

قائم کر سکتی ہے تو سابق وزیروں کی بحالی کے لئے بھی ایک الگ وزارت کیوں نہیں قائم کرتی — ؟

انگورام نے زور سے میز پر مکا مار کر بڑی سختی سے انگریزی میں کہا "There should be a separate ministry for the rehabilition of ministers."

بے شک! بے شک!! میں نے سر ہلا کر پینسل سے اپنی نوٹ بک پر لکھتے ہوئے کہا۔ وہ میری حمایت سے بے حد خوش ہوا۔ رازدارانہ لہجے میں میرے کوٹ کا بٹن پکڑ کے کہنے لگا۔ ہمارے کلب کے تین سو ممبر بن چکے ہیں۔ اور آئندہ سال دو ڈھائی سو کے قریب اور ممبر بن جائیں گے۔

" اور اگر تم" ——— میں نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔
" اس کلب کی ایک شاخ پاکستان میں قائم کر دو اور ایک فرانس میں تو کیسا لطف آئے؟ "

واہ واہ! تم نے کیا عمدہ بات سمجھائی ہے مجھے۔ انگورام نے میرے کوٹ کا بٹن توڑ کر اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "پھر ہم سابق وزیروں کی ایک انٹرنیشنل کانفرنس بلا سکتے ہیں پیرس میں — ارے سنتے ہو پیرس میں؟

پیرس کا ذکر آتے ہی انگورام رائے کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں چند لمحوں کے لئے چپ رہا گویا دل ہی دل میں پیرس کی انٹرنیشنل کانفرنس کے مزے لے رہا ہو۔ پھر یکایک اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے اپنی گھڑی دیکھی اور جلدی جلدی کہنے لگا۔" اُدگھاٹن کا وقت ہو رہا ہے۔ شری گدگداچاریہ آنے والے ہیں۔ تم بھی چلو بڑے ہال میں۔"

وہ مجھے چھوڑ کر جلدی سے بڑے ہال کی طرف بھاگا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ ہال میں جوق در جوق سابق وزیر داخل ہو رہے تھے۔ ہر صوبے، ہر نسل، ہر رنگ، ہر قوم اور ہر زبان کے وزیر تھے۔ شمال کے وزیر اور جنوب کے وزیر، مشرق کے وزیر اور مغرب کے وزیر، دبلے وزیر اور موٹے وزیر۔ لمبے وزیر اور چھوٹے وزیر۔ کالے وزیر اور گورے وزیر، گندمی وزیر اور سانولے وزیر، صحت مند وزیر اور بیمار وزیر، وزیروں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ جب سارا ہال سابق وزیروں سے بھر گیا تو انگو رام رائے ترپاٹھی نے سکریٹری کی حیثیت سے اپنی رپورٹ پیش کی۔ وزیروں کے کلب کے اغراض و مقاصد بیان کئے۔ جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اس نے حکومت کے کام پر بھی کڑی تنقید کی۔ جو ہر وزیر بننے سے پہلے اور وزارت چھن جانے کے بعد کیا کرتا ہے۔ لیکن انگو رام رائے کی تنقید تخریبی نہ تھی تعمیری نہ تھی۔ مجھے اس میں دو تین باتیں بہت دلچسپ اور غور طلب معلوم ہوئیں، ایک اُس نے پنجسالہ منصوبے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بتایا کہ ملک کا اور غیر ملکی زر تبادلہ کا کروڑوں روپیہ فولاد کے کارخانے ڈھالنے میں برباد کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ ہم بڑی آسانی سے خام لوہا نکال کے باہر کے ملکوں کو بیچ کر وہاں سے ڈھلا ڈھلایا فولاد حاصل کر سکتے ہیں اور اس فولاد کی مشینیں بنا سکتے ہیں۔ اس طرح سے ہم اُس کروڑوں بلکہ اربوں روپے کی رقم کو بچا سکتے ہیں۔ جو یہاں فولاد کے مختلف کارخانے قائم کرنے کے سلسلے میں برباد کی جا رہی ہے۔

زرعی سدھار کے سلسلے میں بھی اُس نے بیحد دلچسپ بات کہی۔ زرعی بل کے ناکام ہو جانے کے بعد انگو رام رائے نے بھی ایک زیرک آدمی کی

طرح اپنا عقیدہ بدل دیا تھا۔ اب وہ نہ یہ چاہتا تھا کہ زمین کسانوں میں بانٹ دی جائے نہ یہ چاہتا تھا کہ زمین زمینداروں میں بانٹ دی جائے اب وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ کسان زمینداروں میں بانٹ دیئے جائیں۔

میں خوشی سے اچھل پڑا اخوہ! کس قدر انوکھا اور اچھوتا خیال ہے زرعی انقلاب کا۔ یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ ایسے وزیر کو معزول کر دیا گیا ہے۔ لیکن جھگڑنے کی کوئی بات نہیں، حکومت کو بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور وہ اسے پھر وزیر بننے کا موقع دے گی۔

میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ معلوم ہوا انگودام راؤ کی تقریر ختم ہو چکی تھی اور اب سکریٹری کے اصرار پر شری گدگد اچاریہ اسٹیج پر اس کلب کا ادگھاٹن کرنے کے لئے تشریف لے آئے تھے۔ شری گدگد کو دیکھ کر نہ معلوم میرے ذہن میں کیوں ہُدہُد یا کلنگ کی صورت اجاگر ہونے لگتی ہیں۔ حالانکہ ان دونوں جانوروں کا دور دور تک ایسے دانشمند انسان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ شری گدگد اچاریہ نے اسٹیج پر آکر دونوں ہاتھ جوڑ کر سب کو نمسکار کیا۔ اپنی دھوتی کا سرا ٹھیک کیا اپنے داہنے ہاتھ کو ایک خطرناک تہدیدی انداز میں فضا میں گھما کے کہا۔ "لیڈیز اینڈ جنٹلمین!"

وہ مزید کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ کلب کا ایک چپراسی (جو اپنے اچھے زمانے میں اپنے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ ہوا کرتا تھا، یعنی جب اس کا چپڑاسی [illegible] ہوا کرتا تھا) دوڑا دوڑا ڈائس پر آیا۔ اور جلدی سے اس نے کاغذ کا ایک پُرزہ شری گدگد اچاریہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ بے حد گھبرایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

شری گدگد اچاریہ نے بڑے اطمینان سے اپنی عینک کو ناک پر سرکاتے ہوئے اس کاغذ کے پرزے کو دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولے۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین!"

پیشتر اس کے کہ میں اپنی تقریر شروع کروں ایک ضروری اعلان ہے اسے سن لیجئے۔ مرکزی وزارت میں بڑی اہم تبدیلیاں ہونے والی ہیں مختلف محکموں میں ردوبدل کے بعد اس بات کا بھی گمان ہے کہ مکھیہ منتری مرکزی وزارت میں ایک نئے وزیر کو شامل کریں گے۔ آج سات بجے مکھیہ منتری کی کوٹھی ________"

لیکن اس سے آگے کسی نے شری گدگد اچاریہ کے اعلان کو نہ سنا۔ تمام سابق وزیر اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مرکزی ہال کے دروازے کی طرف یلغار کرنے لگے۔ وہ ایک دوسرے پر پلے پڑتے تھے۔ ہر وزیر یہ چاہتا تھا کہ وہ سب سے پہلے ہال سے باہر نکل جائے۔ دھکم دھکا۔ دھینگا مشتی کا وہ عالم تھا کہ مچھلی مارکیٹ کا نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ کئی موٹے موٹے توندیل وزیر پاؤں تلے آ کے روندے جا چکے تھے۔ اور زمین پر پڑے چلا رہے تھے۔ اور رحم کی التجا کر رہے تھے۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین!" دو تین بار شری گدگد راؤ اچاریہ نے چلا کے کہا۔ پھر یکایک انہیں بھی کچھ یاد آیا۔ اور وہ بھی ڈائس پر اپنی تقریر کا مسودہ پھینک کر ایک اتنی لمبی چھلانگ لگا کر جو اس عمر کے آدمی کے لئے تقریباً ناممکن تھی ہال کے دروازے پر پہونچ گئے۔ اور تیر کی طرح تمام وزیروں کے بیچ سے نکل گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا۔ وزیروں کے کلب میں سناٹا تھا ____

کرسیاں ٹوٹی پڑی تھیں، صوفے اوندھے تھے۔ دو تین وزیر فرش پر پڑے کراہ رہے تھے۔ اور ہسپتال کی ایمبولنس کا انتظار کر رہے تھے۔ اور کلب کے باہر سڑک پہ وزیروں کا جمِ غفیر تھا۔ جو دونوں ہاتھ زور سے جھلاتے ہوئے وزیرِ اعظم کی کوٹھی کی طرف دوڑ رہا تھا۔

لیجئے، ساگ والا گوشت بھی ختم ہو گیا اور آپ کے عقب میں بیٹھا ہوا الگو رام رائے بھی کھانا کھا کے چلا گیا۔ خیر اس کی بات تو ختم ہی تھی اور یہ کمبخت اس وقت یہاں ڈھابے میں آ گیا تو مجھے اس کا واقعہ یاد آ گیا ورنہ واقعہ جو میں آپ کو سنانے والا تھا . . . . وہ دوسرا ہی ہے اور بہت اہم ہے۔

ایک روز کا ذکر ہے میں تپتی دوپہر میں اسی ڈھابے کی ٹین کی چھت کے نیچے بیٹھا ہوا ———— آئیں آپ کدھر چلے؟
———— ارے ہاں تو سنتے جایئے ؟؟ "

دُودھ کا دُودھ پانی کا پانی

چونکہ بہار میں کوئی قحط نہیں ہے اور کہیں بھکمری نہیں ہے۔ اسی لئے تو شامو بہاری ساکن بتیا ضلع مظفرپور اپنے گاؤں سے بھاگ کر زندہ اور صحیح سلامت بمبئی پہنچ گیا تھا۔ اگر بھکمری ہوتی تو وہ کیوں نہ اپنے ہی گاؤں میں بھوک سے مر جاتا۔ بمبئی کیسے پہنچتا اور صرف روٹی کپڑے پر نوکری کیسے تلاش کرتا؟ تو میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی بڑی باتوں کے متعلق بھانپ جایا کرتا ہوں۔ شامو کی آمد سے میں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ بہار میں کہیں پر بھکمری نہیں ہے۔ گورنمنٹ بالکل سچ کہتی ہے اور یہ اخبار والے بالکل جھوٹ بولتے ہیں۔

جب شامو بہاری کو میں گھر لے کے آیا تو لکشمی بے حد خفا ہوئی۔ ساڑی کے پلّو میں لٹکا ہوا چابیوں کا چھلا گھماتے ہوئے بولی۔ "آخر تم یہ چاہتے ہو۔ میں کوئی کام نہ کروں۔ بیٹھ بیٹھ کر موٹی ہوتی جاؤں اور تم

بڑے آرام سے چند سالوں کے بعد کوئی دوسری نانک بانگی لے آؤ۔ نہیں تا۔ میں نہ سنوں گی۔ میں اس نوکر کو نکال دوں گی۔"

میں نے کہا "سنو لکشمی۔ نہیں ——— ذرا سوچو تو پیاری لکشمی! تمہیں اس گھر میں کتنا کام کرنا پڑتا ہے۔"

"کتنا کام کرنا پڑتا ہے؟" لکشمی بھڑک کر بولی۔ "اس گھر میں آدمی ہی کتنے ہیں۔ ایک تم ہو۔ حالانکہ مجھے اس میں شبہ ہے، ایک میں ہوں۔ ایک میرا چھوٹا بھائی ہے۔ دو تمہارے بڑے بھائی ہیں۔ ایک تمہارا باپ ہے۔ ایک میری بیچاری بڈھی ماں ہے۔ پانچ ہمارے بچے ہیں جن میں سب سے چھوٹا ہمارا کشو چار سال کا ہے۔ گھر کے آدمی ہی کتنے ہیں؟ کیا تم نے مجھے اپاہج سمجھ رکھا ہے؟"

"سنو ڈارلنگ! آج کل کے نوکر تو بس گھر کی شوبھا ہوتے ہیں۔ کام سارا تو تمہیں خود ہی کرنا پڑے گا گزشتہ بارہ سالوں کی طرح۔ !"

"تب ٹھیک ہے مگر اسے تنخواہ کیا دینی پڑے گی؟"

"کچھ نہیں، بس روٹی کپڑا۔"

"بس روٹی کپڑا؟" لکشمی زور سے چلائی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر وہ کچھ لمحے بیسویں صدی کے اس نئے معجزے یعنی شامو بہاری کو حیرت سے تکتی رہی جو صرف روٹی کپڑے پر کام کرنے کے لئے آمادہ تھا۔ پھر میری طرف مڑ کر شکایت آمیز لہجے میں بولی "تم تو کہتے تھے بہار میں قحط ———"

"بالکل نہیں" میں نے کہا "بلکہ اس محض روٹی کپڑے پر قناعت کرنے والے نوکر کو دیکھ کر بمبئی میں بھی قحط نہ آنے کا اندیشہ پیدا ہو چلا ہے۔"

"تب تو ٹھیک ہے"، لکشمی نے سر ہلا کر کہا "چل رے شامو اس کمرے میں جھاڑو دے"

جھاڑو دینے کا حکم بجا لاتے ہوئے جب شامو نے جواب میں غسل خانے کا لوٹا پیش کیا تو لکشمی چند لمحوں کے لئے حیران رہ گئی ـــــ بعد میں جب کنگھی مانگنے پر لکشمی کو جوتا ملا اور مجھے تولیہ مانگنے پر جوتا پیش کیا گیا تو میں سمجھ گیا کہ بہار میں نہ صرف یہ کہ قحط نہیں ہے بلکہ وہاں پر ایک زبان ایسی بھی بولی جاتی ہے جس کا نام میتھلی ہے۔ اور جو ہماری زبان سے بہت مختلف ہے۔ اس سے پہلے میں میتھلی کو بھاشا کا درجہ دینے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا کیونکہ ہندوستانی دودھان میں میتھلی بھاشا کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔

بہر حال آدمی اپنے تجربے سے سیکھتا ہے۔ میں نے لکشمی سے اس کا ذکر کیا۔ چلو اچھا ہی ہوا اب تمہیں میتھلی بھاشا بھی سیکھنا پڑے گی۔ بہت عرصے سے تم نے لکھنا پڑھنا چھوڑ رکھا تھا۔

چھ ماہ کے عرصہ ہی میں شامو گھر کے کاموں میں طاق ہو گیا۔ کچھ ہم نے اس کی بھاشا سیکھ لی۔ کچھ اس نے ہماری غفلت سے فائدہ اٹھانا سیکھ لیا۔ ایک سال کے عرصے ہی میں اس نے ہر اتوار کو چھٹی لیکر سینما جانا شروع کر دیا اور دو روپے نقد تنخواہ کا مطالبہ کرنے لگا۔ جو دوسرے سال پانچ روپے پر پہنچ گئی۔ اب وہ اپنی ملازمت کے تیسرے سال میں تھا۔ اب اس نے اپنی چٹیا منڈا ڈالی تھی۔ انگریزی بال رکھ لئے تھے اور دوسرے فیشن ایبل گھروں کے نوکروں کی طرح نیکر اور بش شرٹ میں گھومتا پھرتا تھا۔ اور میتھلی کے بجائے بمبئی کی بازاری زبان میں گفتگو کرنے لگا۔ جب لوگ اپنے

ملک کی بھاشا اور سنسکرتی کو بھول جاتے ہیں تو مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ روٹی کپڑا مانگتے مانگتے جب لوگ اپنی ملازمت کے تیسرے سال ہی میں دس روپے تنخواہ کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ فوراً اٹھ کر پلاننگ کمیشن کا ممبر بن جاؤں۔ ہم ہندوستانیوں میں اگر کوئی کمی ہے تو صرف کردار کی۔ اور جب تک فرد کا کردار اونچا نہیں ہوگا یہ قوم کیسے اونچی ہو سکتی ہے۔ مگر میں نے شامو کو دس روپے تنخواہ دینا بھی منظور کر لیا۔ ایک تو اس لئے بھی کہ محلہ میں دوسرے نوکروں کی تنخواہیں اس سے کہیں زیادہ تھیں۔ پھر یہ بھی بات ہے کہ۔ جانے کیوں میرے دل میں غریبوں کے لئے بڑا درد ہے۔ اس کے علاوہ شامو گھر کے لوگوں کا مزاج خوب سمجھ چکا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ گھر کے سب لوگ نوکر کا مزاج خوب سمجھ چکے ہیں۔ نیا نوکر آئے گا تو اس کے مزاج سمجھنے میں بڑی دقت ہوگی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ شامو میں ہزار نقائص پیدا ہو گئے ہوں وہ گھر کا کام بڑی دلچسپی سے کرتا ہے اور ہر وقت کام میں جٹا رہتا ہے۔ کبھی بیمار نہیں پڑا۔ اور بمبئی کا پانی تو ایسا خراب ہے کہ یہاں آ کر ہر نوکر بھی ہفتے میں دو بار بیمار پڑ جاتے ہیں اور مجھے صحت مند چاق چوبند لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔ فرد کی صحت پر قوم کی صحت کا دار و مدار ہے علیٰ ہذا القیاس!

شامو کی ملازمت کے تیسرے سال ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ان دنوں لکشمی کو چھٹا ماہ لگ رہا تھا۔ اور وہ بیچاری آنے والے بچے کے لئے کپڑے اور دیگر سامان تیار کر رہی تھی۔ اس نے بڑی محنت سے خوبصورت سے ننھے ننھے سے چھ فراک سئے۔ مگر اس میں سے دو فراک غائب

ہو گئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ان دو ننھے ننھے فراکوں کو چرانے والا کون ہو سکتا ہے۔ گھر بھر میں ڈھونڈ لیا لیکن فراک نہ ملے۔ پل بھر کے لئے نتامو پر شبہ کیا گیا لیکن پھر دوسرے لمحے ہی میں ہنس کر اس خیال کو دل سے نکال دیا گیا۔ اب اگر گھر کے کسی بڑے آدمی کا کپڑا ہوتا تو فوراً سب سے پہلے دھیان اسی طرف جاتا۔ اس کے بعد منے کے لئے ایک پیاری سی رلائی جسے لکشمی نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے تگندا تھا اچانک گھر سے غائب ہو گئی۔ محلے کی بوڑھیوں نے مشورہ دیا کہ کسی جھاڑ پھونک والے کو بلانا چاہیئے ہو نہ ہو گھر پر کسی آسیب کا سایہ پڑ رہا ہو جو آنے والے بچے کے لئے خطرناک ہے۔ لکشمی نے ڈر کر مجھ سے التجا کی۔ مجھے دراصل اس قسم کے ڈھکوسلوں میں یقین نہیں۔ مگر میں کسی دوسرے کے مذہبی عقائد میں بھی دخل اندازی نہیں کرتا۔ پھر ہندوستان میں تو ایک لادینی ریاست قائم ہو چکی ہے اس لئے میرے لئے یعنی ایک پر امن شہری کے لئے یہ اور بھی لازم تھا کہ لکشمی کے عقائد کا احترام کرتے ہوئے پنڈت گردھر پرشاد کو گھر پر دعوت دوں۔ اور پنڈت گردھر پرشاد سات دن ہمارے گھر آ کر جاپ کرتے رہے۔ جس سے گھر کی ساری فضا ایک دم بدل گئی۔ ماحول روشن روشن سا معلوم ہونے لگا۔ لکشمی کی بشاشت عود کر آئی اور اس کے بعد سے گھر میں اس قسم کی چوریوں کا سلسلہ بھی یک لخت منقطع ہو گیا جس سے اس خیال کو مزید تقویت پہنچی کہ ہو نہ ہو گھر پر کوئی سایہ تھا۔ جو پنڈت جی کے جاپ سے ڈر کر کہیں چلا گیا ہے۔ اس دن سے میں نے گھر والوں کے مذہبی عقائد میں دخل دینا اور بھی کم کر دیا ہے۔ بلکہ لکشمی کے بیحد اصرار پر دفتر میں اپنی ترقی کے لئے بھی پنڈت جی سے جاپ کرانا شروع کرا دیا ہے۔ حالانکہ

اپنے خیال پر اس سختی سے کاربند ہوں۔ لیکن اگر میرے ایک دو راے حاصل کرانے سے گھر کی لکشمی خوش رہتی ہے تو میرا کیا [illegible] ہے۔؟

تین ماہ [illegible] لکشمی نے یہ ایک شکایت کی "دودھ میں پانی ملایا جاتا ہے دو دن سے دیکھ رہی ہوں دودھ کا [illegible]"

"[illegible] دودھ کا نہیں، تمہاری زبان کا ذائقہ بدل گیا ہے۔ اس حالت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

لکشمی بولی [illegible] مجھے اُبکائیاں آنے لگتی ہیں"

"اُبکائیاں بھی آتی ہیں" میں نے تسلی دے کر کہا "کیا اتنی جلدی بھول گئیں؟"

"[illegible] اندھی نہیں ہوں" لکشمی نے جل کر کہا "جو اچھے اور بُرے دودھ میں تمیز نہ کر سکوں۔ ضرور گوالا کوئی اس دودھ میں ملاوٹ کر رہا ہے۔"

"سرکاری ڈیری سے سربمہر بوتل میں بند دودھ آتا ہے۔ یہ دودھ خالص کیسے ہو سکتا ہے؟"

"دودھ ایک دم برا ہے" لکشمی نے جھلا کے کہا "تم خود چکھ کے دیکھو"

شادی کے بعد میں تو دودھ کا ذائقہ ہی بھول گیا۔ بچوں ہی کے لئے پورا نہیں ہوتا۔ مجھے کیا معلوم ہوگا۔ لیکن جب لکشمی کی بے چاری بڈھی ماں نے جو ہر دم گاؤ تکیے سے لگی حکم چلایا کرتی تھیں اور [illegible] سال کی عمر پر بھی مرنے کا نام نہ لیتی تھیں دودھ کے متعلق شکایت کی تو مجھے غور کرنا پڑا۔ مگر غور کروں تو کیا کروں۔ گذشتہ تین سال [illegible] شامو نے ایک [illegible] بھی دودھ کی چوری نہ کی تھی۔ ایک پائی کی چیز ادھر سے ادھر نہ کی تھی

بھر اسٹیشن کے پاس جو سرکاری ڈیری کی شاخ ہے وہاں سے مہر بند بوتل آتی تھی۔ ہر روز صبح سات بجے شامو ڈیری کی شاخ پر جاکے کیوُ لگاتا تھا اور اپنی باری پر بوتل لے کر گھر آتا تھا۔ گھر پر آکر سب کے سامنے کھانے کی میز پر دودھ کی بوتل رکھ دیتا تھا۔ ہر شخص دیکھ سکتا تھا کہ مہر سلامت ہے۔ اب ڈیری والے دودھ میں پانی ڈالتے ہوں تو دوسری بات ہے۔ اگر ایسا ہو تو محلے والے — دوسرے گھروں کے لوگ جہاں پر بھی ڈیری سے دودھ آتا ہے، کیوں شکایت نہیں کرتے۔ اکیلی لکشمی ہی کو یہ شکایت کیوں ہے؟ ہونہ ہو لکشمی کی زبان کا ذائقہ بدل چکا ہے اور وہ بڑھی ماں تو سٹھیا گئی ہیں۔ یا اپنی بچی کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہیں۔ اس نے میں نے اچھی طرح سے سوچ ساچ کر لکشمی کو ڈانٹ دیا لیکن جب میرے ڈانٹنے پر بھی لکشمی کی شکایت رفع نہ ہوئی تو میں نے شامو سے کہہ دیا۔

"آج سے دودھ کی بوتل میں خود لایا کروں گا تم گھر کا دوسرا کام کرو۔"
شامو کو برا تو بہت معلوم ہوا مگر فرمانبردار نوکر تھا۔ "اچھا جناب" کہہ کر سر جھکا کے کچن میں چلا گیا۔

دوسرے دن جب سات بجاتے بجاتے گھڑی نے آٹھ بجا دئے تو میں بہ ہزار دقّت پلنگ سے اٹھ کر شادی کرنے کی حماقت پر نفریں بھیجتا ہوا کچن میں چلا گیا۔ کچن میں شامو منہ لبورے کھڑا تھا۔ میں نے اس سے ایک خالی جھولا طلب کیا۔ اُس میں دودھ کی خالی بوتل کو ڈالا۔ دودھ کا راشن کارڈ جیب ... رکھا اور اسٹیشن پر دودھ لینے کے لئے روانہ ہوا۔ دیر ہو چکی تھی اس لئے جب ... شاخ پر پہونچا جہاں سے دودھ ملتا ہے وہیں پر نوکروں کا ایک لمبا

کیوؑ پہلے سے موجود تھا۔ میرے آگے ایک سانولی کھرّی دُبلی پتلی نوکرانی تھی۔ جس کے چہرے پر پرچھائیاں تھیں۔ اور جو بڑی مشکل سے سانس لیتی تھی اور جس کے پیٹ میں غالباً نو ماہ کا بچہ ہوگا۔ قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی بچہ جن دے گی۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ اور جب اس نے مجھے اپنے پیچھے آکر کھڑے دیکھا تو اس کی آنکھیں ایک دم سے بجھ سی گئیں اور وہ بیحد پژمردہ اور اداس سی نظر آنے لگی۔ لیکن میں نے اس کا کوئی خیال نہ کیا کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ صنف نازک پر مجھے دیکھ کر اسی طرح کا ردِّعمل ہوتا ہے۔ میں نے اپنی پتلی سی گردن کو ذرا سا اونچا کیا اور نگاہیں اٹھا کے دیکھنے لگا کہ ابھی کیوؑ کتنا باقی ہے۔

یکایک اس لڑکی نے کہا ”آج شامو نہیں آیا؟“

میں نے بڑی نخوت سے جواب دیا ”نہیں؟“

”نہیں“، میں کچھ اصلاح کے چھلکے بھی شامل تھے۔ ”تم کون ہوتی ہو مجھ سے یہ سوال کرنے والی؟ میں نوکر پیشہ لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ میں یہاں ہر روز دودھ لینے نہیں آتا۔ میں اس قسم کے ذلیل کام خود نہیں کیا کرتا۔ تمہاری یہ مجال کہ آج تم ایک نوکرانی ہو کر مجھ سے یوں بے تکلفی سے سوال کر رہی ہو۔ صرف اس لئے کہ میں تمہارے پیچھے کیوؑ میں کھڑا ہوں۔ کوئی بات نہیں ہے میں اس کا علاج ڈھونڈ نکالوں گا۔ میں آج ہی سرکاری ڈیری کے منیجر کو خط لکھتا ہوں کہ وہ ڈیری کی ہر شاخ پہ دو کیوؑ لگوائے ایک نوکروں کے لئے دوسرا نوکروں کے مالکوں کے لئے۔ ورنہ لا اینڈ آرڈر کے لئے سخت خطرہ ہے! ہونہہ!

اس لڑکی نے بڑی ملتجیانہ انداز میں مجھ سے پوچھا ”کیا وہ بیمار ہے؟“

"نہیں ، بالکل ٹھیک ہے۔ مگر آج سے وہ یہاں دودھ لینے نہیں آئے گا،" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ چُپ ہوگئی۔

وہ بار بار کبھی اپنا ایک پاؤں اٹھاتی کبھی دوسرا۔ آرام لینے کی کوشش کرتی مگر کیوٗ آخر کیوٗ ہے۔ یہاں ہر شخص کی اپنی باری پر باری آتی ہے۔

اُس کی باری بھی آ گئی اور اس نے اپنے مالک کے گھر کے لئے ایک چھوٹی بوتل میں دودھ لے لیا۔ پھر میری باری آ گئی اور مجھے بڑی بوتل مل گئی۔ بوتل لے کر جیب میں پلٹا تو وہ لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی اور اس گرسنہ نگاہوں سے دودھ کی بوتل کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے ایک ہی گھونٹ میں اُسے پی جائے گی۔ اُس نے مُنہ سے تو کچھ نہ کہا لیکن اس کا آگے بڑھا ہوا دست طلب کی طرح پیٹ گویا مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"میں خود تو کچھ نہیں چاہتی اور مجھے کچھ چاہیئے بھی نہیں لیکن میرے اندر جو یہ معصوم جان ہے، یہ جو ظالم لوتھڑا ہے جو میرا دن رات خون چوستا ہے اس کی طلب کو میں کیا کروں۔ میں ایک غریب نوکرانی ہوں جسے خود پیٹ بھر کر کے روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ میں پھر اس آنے والی جان کے تقاضے کیسے پورے کروں۔ یہ دودھ مجھے دیدو۔ یہ دودھ مجھے دیدو . . . بھگوان کے لئے ———— اب صرف چند دنوں کی بات ہے۔ پھر بھگوان میرے سینے میں دودھ اتار دے گا، پھر میں تم سے کبھی اس دودھ کی بھیک نہ مانگوں گی"

میں نے دودھ کی بوتل جھولے میں ڈالتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تم شامو کو جانتی ہو؟"

"وہ میرا گھر والا ہے،" اس لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

بڑی پلکیں حیا سے اس کے رخساروں پر جھک گئیں۔ [illegible] گی جو نکا چر کچھ دیر خاموش رہکر وہاں سے پلٹ کر اپنے گھر جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔

گھر پہنچتے ہی مکشی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ پوچھنے لگی۔ "کیا معلوم ہوا؟"

"یہی معلوم ہوا کہ بہار میں قحط ہے، میتھلی ایک خوبصورت زبان ہے اور بہر تو کر ایک دل رکھتا ہے۔"

"کیا مطلب"

"مطلب یہ کہ کوئی امیر گھر سے ایک ننھی سی دُلائی اس لئے چراتا ہے کہ کسی کی بے آسرا جان کو تھوڑی سی حرارت مل جائے، کوئی ہیں دودھ میں پانی ملا کے اس لئے پلاتا ہے کہ کسی کی زندگی کو تھوڑا سا آب حیات مِل جائے۔ مکشی اس دنیا میں بچوں کی دلائیاں اور دودھ کی بوتلیں اس قدر کم کیوں ہیں؟"

مکشی کچھ نہ سمجھی، حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ میں کمرے سے باہر چلا آیا۔ باہر شامو اپنا بستر باندھ رہا تھا اور نوکری چھوڑ کر جانے کے لئے بے تاب تھا۔

میں نے کہا "شامو کل سے دودھ تم ہی لایا کرو گے۔ میں نے تحقیقات کر لی ہے۔ تمہارا لایا ہوا دودھ بے حد میٹھا اور عمدہ ہے صرف دنیا کا ذائقہ بدل چکا ہے۔"

بِلّی اور وزیر

شری اُپادھیائے کا ارادہ قطعی طور پر وزیر بننے کا نہیں تھا وہ گل شاہ تار امیں ایک معمولی سے وید تھے۔ گل قند، سدھ مکردھوج اور جوارش کموتی مروارید والی بیچتے تھے۔ مگر قصہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ چیف منسٹر کے بھانجے کو جس کا اسی گلی میں کوٹلوں کا ڈپو تھا، پیچش ہوگئی۔ اور وہ شری اُپادھیائے کے علاج سے ٹھیک ہوگیا۔ اُس نے بر سبیل تذکرہ چیف منسٹر سے شری اُپادھیائے کا اس کا ذکر کر دیا۔ چیف منسٹر کو عرصے سے بواسیر کی بیماری تھی اور کسی طرح ٹھیک نہ ہوتی تھی۔ چیف منسٹر نے اپنے بھانجے کے اصرار پر شری اُپادھیائے کو بلا بھیجا۔ اور ان کا علاج شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے چیف منسٹر صاحب کی پرانی بواسیر چھ مہینوں میں ہی اُپادھیائے جی کے علاج سے ٹھیک ہوگئی۔ اب کیا تھا۔ شری اُپادھیائے چیف منسٹر کے خاندانی حکیم ہوگئے۔ اُن کا شمار چیف منسٹر کے اپنے آدمیوں میں ہونے لگا۔ شری اُپادھیائے جی کی حکمت وہ چلی کہ انھیں ایک سال کے عرصے میں ہی اپنے مریضوں کو دیکھنے کے لئے ایک گاڑی خریدنی پڑی۔ گھر سے بنگلے میں رہنا پڑا

بنگلہ میں ٹیلیفون لگانا پڑا، بینک میں اکاؤنٹ کھولنا پڑا۔ غرضیکہ چیف منسٹر صاحب کی دوستی ان کے لئے اچھی خاصی مصیبت بن گئی۔

لیکن یہ سیاسی آدمی آپ تو جانتے ہیں ایک دفعہ جس کے پیچھے پڑ جائیں زندگی بھر اسے چین نہیں لینے دیتے۔ ایک دن اُپادھیائے جی کو چیف منسٹر نے بلایا اور کہا۔

"اپادھیائے جی! آپ تو ہمارے اپنے ہی آدمی ہیں۔ آپ جنتا منڈل کے سکریٹری کیوں نہیں بن جاتے" اپادھیائے جی نے بہت انکار کیا اور بولے۔

"سرکار میں آج کل ماء اللحم اور دراکشا سو ملا کر ایک نئی دوا بنانے میں مصروف ہوں۔ یوں سمجھئے گویا حکمت میں بیدک کا پیوند لگا رہا ہوں۔ دیکھئے اب اس قلم سازی سے کون سی نئی چیز نکلتی ہے"

"کون سی نکلے گی؟" چیف منسٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں"

اس پر چیف منسٹر نے اور حیران ہو کر پوچھا۔ "مگر یہ دوا جو ابھی آپ کو معلوم نہیں کہ کیا ہوگی، کس غرض کے لئے ہوگی؟"

"یہ بھی معلوم نہیں!" شری اپادھیائے جی نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ انگریزی طریقۂ علاج میں پہلے بیماری ڈھونڈی جاتی ہے، بعد میں اس کا علاج دستیاب ہوتا ہے۔ ہم لوگ پہلے دوا بنا لیتے ہیں۔ بعد میں اس کے لئے بیماری ڈھونڈتے ہیں"

"تو بالکل ٹھیک ہے!" چیف منسٹر نے سر ہلا کے کہا۔ "آپ پہلے جنتا منڈل کے سکریٹری ہو جایئے بعد میں آپ کے لئے کام ڈھونڈ لیا جائے گا"

چنانچہ شری اُپادھیائے جنتا منڈل کے سکریٹری چنے گئے۔ کیونکہ

وہ چیف منسٹر کے اپنے آدمی تھے۔ پھر جب اسمبلی کا الیکشن سر پر آگیا تو چیف منسٹر نے انھیں پھر بلا بھیجا۔ اور کہا " اپادھیائے جی! منڈل کے لوگ آپ کے کام کی بہت تعریف کرتے ہیں "

اُپادھیائے جی نے حیران ہو کر کہا۔ " مگر سرکار میں تو منڈل میں ایک بار بھی نہیں بولا "

" یہی تو قابل تعریف بات ہے " چیف منسٹر نے سر ہلا کے کہا " دیکھئے آجکل الیکشن سر پر آرہے ہیں۔ میرے خیال میں آپ اسمبلی کے لئے اپنے حلقے سے ممبری کی درخواست دیدیجئے۔ آپ اپنے آدمی ہیں اور ـــــــــ "

" مگر جناب " شری اُپادھیائے نے بالکل پریشان ہو کر کہا۔ " میں ان دنوں بہت مصروف ہوں۔ آپ کے کامرس ڈیپارٹمنٹ کے جوائنٹ سکریٹری شری کرپا رام ناتھ کا علاج کر رہا ہوں "

" انھیں کیا بیماری ہے؟ " چیف منسٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا

" بیماری تو انھیں وہ ہے جو میں ان کی بیوی کو بھی نہیں بتا سکتا۔ اب آپ خود ہی سمجھ جائیے "

چیف منسٹر کی آنکھوں میں ایک شریر چمک نمودار ہوئی۔ رازدارانہ لہجے میں بولے۔ " تو آپ اُن کا علاج ٹھیک طرح سے کر رہے ہیں نا "

" علاج تو کر رہا ہوں " اُپادھیائے جی رُک رُک کر بولے " لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا علاج کروں؟ دراصل اس بیماری کا صحیح علاج سنکھیا ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں کتنا سنکھیا کھلاؤں، جس سے اُن کی بیماری تو مر جائے لیکن وہ خود تو مریں۔ اگر سنکھیا کم دیتا ہوں تو ان کی بیماری نہیں جاتی۔ زیادہ دیتا ہوں تو وہ خود مر جاتے ہیں "

" مرنا جینا تو بھگوان کے ہاتھ میں ہے،" چیف منسٹر نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ " مگر الیکشن تو اپنے ہاتھ میں ہے نا، اس لئے آپ بس دیر نہ کیجئے، آپ اسی الیکشن میں کھڑے ہو جائیے۔ آپ اپنے آدمی ہیں اور ..."

چنانچہ شری اُپادھیائے جی اسمبلی کے ممبر ہو گئے۔ پھر وزارت سازی کے موقع پر جب چیف منسٹر صاحب اپنی وزارت مرتب کرنے لگے تو انھیں اپنے آدمیوں کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ انھوں نے شری اُپادھیائے جی کو محکمۂ صحت کا وزیر بنا دیا۔ اور جنگل کا محکمہ بھی انھیں کے سپرد کر دیا۔ کہ ہر طرح کی جڑی بوٹی کی دریافت جنگل ہی سے ہوتی ہے۔

شری اپادھیائے جی نے وزیر بننے سے بہت انکار کیا۔ ایک تو ان کی دھرم پتنی گیارہ بچوں کے بعد پھر سے حاملہ تھیں۔ پھر ان دنوں ہی وہ ایک مقامی رئیس اور کارخانے دار کی فرمائش پر سچے موتی اور جواہرات والا اسدھ مکر دھوج بنانے میں مصروف تھے مگر چیف منسٹر صاحب نے اُن کی ایک نہ مانی۔ بولے " آپ یہ بھی تو سوچئے کہ اب تک جتنے وزیر میں لے چکا ہوں۔ کسی کی عمر ساٹھ برس سے کم نہیں ہے اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں جسے کوئی نہ کوئی بیماری لاحق نہ ہو، کسی کا سر ہلتا ہے تو کوئی دمہ میں مبتلا ہے، کسی کو ذیابیطس ہے تو کوئی ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہے اس لئے بھی وزارت میں کسی نہ کسی حکیم یا وید کا ہونا ضروری ہے۔ آپ اپنے آدمی ہیں اور ـــــ"

" بے شک، بے شک" چیف منسٹر کے پرائیویٹ سکریٹری نے سر ہلا کر کہا اور شری اُپادھیائے جی وزیر بن گئے۔

شری اپادھیائے جی وزیر تو بن گئے لیکن وہ اس وزارت بازی

سے خوش نہ تھے۔ ایک تو انھیں انگریزی بھی اپنے دیس کی اصلی راشٹر بھاشا آتی نہ تھی۔ پھر ہندی کا ورارد دو کو بھی وہ واجبی سی جانتے تھے۔ اس لئے وزارت کا سارا کام انھوں نے محکمے کے پرسنل سکریٹری کو سونپ رکھا تھا اور خود دوسرے وزیروں کے علاج میں لگے رہتے تھے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ یہ کام بجائے خود اتنا بڑا تھا کہ انھیں اپنی وزارت کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی کہاں تھی۔!

ایک روز سہ پہر میں جب آسمان کا رنگ عرق گاؤزبان کی طرح شفاف تھا اور زمین ترپھلا کی طرح زردی مائل اور بھورے رنگ کی ہو رہی تھی۔ اور اپادھیائے اپنی کھرل میں اصل کشتہ عنبری مرجان والا گھونٹ رہے تھے۔ چیف منسٹر کا پرائیویٹ سکریٹری ان کے پاس آیا اور ان کے کان میں کہنے لگا۔

"ابھی چلئے! چیف منسٹر صاحب نے بلایا ہے، بے حد ضروری کام ہے"

"کیا انھیں دل کا دورہ پھر پڑ گیا؟"، اپادھیائے جی ایکدم متفکر ہو کر بول پڑے"

"نہیں دورہ نہیں ہے" پرائیویٹ سکریٹری جلدی سے بولا "تو پھر میں کون سی دوا اپنے ساتھ لے چلوں، جلدی سے بتائیے، انھیں کیا بیماری ہے؟"

"کوئی بیماری نہیں ہے"، پرائیویٹ سکریٹری نے ذرا پریشان ہو کر کہا "ایک سرکاری کام ہے"

"سرکاری کام ہے تو میرے محکمہ کے پرسنل سکریٹری شری جتیندر ناتھ کندن کو بلا لیجئے میرے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں اس کھرل میں کیسی قیمتی دوا گھونٹ رہا ہوں۔؟"

چیف منسٹر کے پرائیویٹ سکریٹری نے بڑی خوشامد کی۔ آخر بمشکل سے اُپا دھیائے جی جانے کے لئے تیار ہوئے۔

جب اپادھیائے جی چیف منسٹر کی کوٹھی پر پہنچے تو وہاں خوشامدیوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ بڑی مشکل سے چیف منسٹر صاحب نے ان سے چھٹکارا پایا اور پھر سیدھے اپادھیائے جی کی طرف متوجہ ہوئے۔ بولے "وزارت خطرے میں ہے"

"کس کی؟" اپادھیائے جی نے پوچھا۔ "میری یا آپ کی؟"

"سب کی" ــــــ اور اگر اس وقت آپ نے میری مدد نہ کی تو میں مارا جاؤں گا"

"اپادھیائے جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا" میں آپ کا اپنا آدمی ہوں۔ کس دن کام آؤں گا۔ اس کمبخت کا نام آپ بتا دیجئے جس نے آپ کو اس قدر پریشان کر رکھا ہے۔ میں شہر کے دوچار غنڈوں کو جانتا ہوں ــــــ چاقو کے ایک ہی وار میں ــــــ"

"نہیں نہیں اپادھیائے جی! آپ بات کو سمجھتے نہیں! یہ غنڈوں کے کئے سے کام نہ ہوگا۔ یہ کام تو آپ کو کرنا ہوگا۔"

اپادھیائے جی کانپ گئے۔ بولے "یہ کام تو میں نے آج تک کبھی نہیں کیا آپ کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ لیکن کسی کی جان لینا ــــــ !!"

چیف منسٹر صاحب ہنس کر بولے "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ میں کہاں کسی کی جان لینے کو کہہ رہا ہوں۔ میں تو ایک سرکاری کام کے بارے میں بات کر رہا ہوں"

"وہ کیسا کام ہے؟"

"قومی بچت یا"

"قومی بچت ؟"

"ہاں قومی بچت ۔" آج کل قومی بچت کا خیال مرکزی سرکار کے سر پر بھوت بن کر سوار ہے ۔ گذشتہ ایک مہینے سے برابر چھٹیاں آ رہی ہیں سرکاری، نیم سرکاری، ٹرنک کال، ہر لمحہ مجھے دھمکی دی جا رہی ہے کہ اگر میں نے قومی بچت کے کام کو سنجیدگی سے پورا نہ کیا تو میری وزارت بدل دی جائے گی۔"

"یہ قومی بچت کیا ہوتی ہے ؟" ابا دھیائے جی نے خوفزدہ ہو کر پوچھا ۔ وہ بیچارے سرکاری کاموں سے ہمیشہ کتراتے تھے ۔

"مطلب یہ ہے ابا دھیائے جی کہ سرکاری کام میں بچت کرنا سرکاری خرچ میں کمی کرنا ۔ اگر دس روپے کا کام ہو تو اسے پانچ روپے میں پورا کر لینا اگر کام میں دس آدمیوں کی ضرورت ہو تو اسے دو آدمیوں سے چلا لینا اس طرح کی سکیم کو قومی بچت کہتے ہیں ۔"

ابا دھیائے جی سوچ سوچ کر بولے ۔ " تو آپ وزیروں کی تنخواہیں کم کر دیجئے ۔"

"وزیروں کی تنخواہ پہلے ہی کم ہو چکی ہے ۔ اور اب کیا کم ہو گی ؟"

چیف منسٹر چیں بر جبیں ہو کر بولے ۔

" تو آپ ایک وزیر ہی کم کر دیجئے ۔ میرا استعفا حاضر ہے"

ابا دھیائے جی خوش ہو کر بولے

"مگر ایک وزیر کم کرنے سے کیا ہو گا ۔ ابا دھیائے جی ؟"

"تو . . . تو . . . . دیکھئے میرے محکمے میں پندرہ کے قریب

سکریٹری صاحبان ہوں گے۔ گھٹا کے سات کر دیجیے۔"

"سات آدمیوں کی بچت سے بھلا کیا ہوگا؟" چیف منسٹر صاحب اداس ہو کر بولے "اور نیچے جائیے!" چیف منسٹر صاحب نے مشورہ دیا۔

اپادھیائے جی سکریٹری کی سطح سے نیچے اتر کر سوچنے لگے۔ بولے "تو محکمہ پولیس کے سپرنٹنڈنٹ آدھے کر دیجیے۔ ساٹھ کے تیس رکھیے۔"

"تیس کی بچت سے بھی کیا ہوگا۔ اور نیچے جائیے۔ اور نیچے . . . ."

اپادھیائے جی اور نیچے گئے۔ کلرکوں تک پہنچے تو چیف منسٹر کا دل ذرا خوش ہوا۔ اور جب چپراسیوں پر پہنچے تو چیف منسٹر کی باچھیں کھل گئیں۔ انھوں نے فوراً اپادھیائے جی کو گلے لگا لیا۔ بولے۔

"اب آپ کچھ کچھ وزیر ہوتے جا رہے ہیں۔ دراصل ہم لوگوں ——— ہم وزیر لوگوں کو بہت نیچے اتر کر عوام کی سطح پر سوچنا چاہیے آپ ایک کام کیجیے۔ میرے خیال میں آپ کا ایک دورہ بھی ہو جائے۔"

"دورہ؟" "مجھے تو دل کا دورہ نہیں پڑتا۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔!"

"میرا مطلب علاقے کے دورے سے ہے۔ آپ تین تال کا ایک چکّر لگا لیجیے۔ تین تال پُر فضا پہاڑی مقام ہے اور آپ نے اب تک اپنے علاقے کا ایک دورہ تک نہیں کیا۔ اس سے دوسرے وزیروں کو آپ سے شکایت پیدا ہو چلی ہے۔ لہٰذا آپ تین تال کا دورہ کر آئیے، اور وہاں بیٹھ کر قومی بچت کے سلسلے میں اپنی تجاویز ٹھیک طرح سے سوچ لیجیے اور اگر ہو سکے تو وہاں مقامی اداروں کو دیکھ کر ان میں بھی بچت کر دیجیے۔ میں آپ کو پورا پورا اختیار دیتا ہوں اس سلسلے میں۔"

باتیں کرتے کرتے سہ پہر سے شام ہو گئی۔ جب اپا دھیائے جی چیف منسٹر کی کوٹھی سے نکلے تو انھوں نے تین تال جانے کا اور وہاں جاکر قومی بچت کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ وہ بے حد مسرور ہو کر چیف منسٹر کے بنگلے سے باہر نکلے۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ مغربی آسمان میں شفق کا رنگ شربت عناب کی طرح تھا۔ اور کہیں کہیں آسمان پر تارے تخم خربزہ کی طرح نکلے ہوئے تھے۔

محکمہ جنگلات کے کنزرویٹر ٹھاکر منونت سنگھ بڑے عمدہ شکاری تھے پرانے تجربہ کار حکمراں تھے۔ انگریزوں کا زمانہ دیکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے شری اپا دھیائے جی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تین تال کے بوٹ کلب میں انھیں شاندار دعوت دی اور ان کا مقابلہ ہندوستان کے پرانے دیدوں چرک اور شرنت سے کیا۔ مہارانی آف باندی پور نے ان کے اعزاز میں ایک محفل رقص منعقد کی اور مہاراجہ گول مال پور انھیں بلیک پر مچھلی کا شکار کرانے لے گئے۔ جب یہ راؤنڈ پورا ہو چکا اور شری اپا دھیائے جی نے تین تال کے جنگلات دیکھنے چاہے تو ٹھاکر منونت سنگھ نے راجہ آف بانسی پور سے کہہ کر ایک ہاتھی کا بندوبست کیا اور ٹھاکر منونت سنگھ شری اپا دھیائے کو ایک ہفتے تک تین تال کی ترائی کے جنگلوں میں لئے پھرے۔

ٹھاکر منونت سنگھ کو شکار کا بہت شوق تھا۔ انگریزوں کے وقت میں چیف کنزرویٹر کو جنگل کی سواری کے لئے ایک ہاتھی ملتا تھا لیکن قومی حکومت کے آنے سے ہاتھی کمیٹ میں آگیا۔ اس کا بھی منونت سنگھ کو بہت غم تھا مگر وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ دو چار بار انھوں نے کوشش کی، ایک مرتبہ

خود چیف منسٹر سے کہا۔ لیکن ہاتھی برابر تخفیف میں رہا۔

شری اپادھیائے جی کو البتہ شکار سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے جنگل میں گھومتے گھومتے جب ٹھاکر منونت سنگھ "ہائے وہ چیتا نکل گیا" کہہ کر ہاتھ ملتے تو شری اپادھیائے جی زور سے چلا پڑتے "ارے وہ جھاڑی آپ نے دیکھی؟"

"کون سی؟" ٹھاکر منونت سنگھ اپنی بے دلی پر قابو پاتے ہوئے پوچھتے۔

"وہ جس پر چھوٹے چھوٹے سنہرے رنگ کے پھول لگے ہیں"

اس کے بعد شری اپادھیائے جی ہاتھی رکوا کر نیچے اترتے اور جنگل سے بوٹی توڑ کر ٹھاکر منونت سنگھ کو دکھاتے اور کہتے۔

"دیکھئے، عام لوگ اسے 'کٹ پڑٹی' کہتے ہیں مگر پراکرت میں اسے پڑی کٹ کہتے ہیں۔ سنسکرت میں یہ ریٹھ کرک ہے۔ یونانی میں یہ بازکلیلہ ہے"

"عجیب جھمیلا ہے" ٹھاکر حیرت سے بولے۔ "کیونکہ میرے خیال میں تو یہ آملے کا پیڑ ہے"

"جی ہاں! وہی تو ہے مگر بڑے کام کی چیز ہے۔ اس کے فائدے۔

اس کے بعد شری اپادھیائے جی نے پھر ہاتھی پر چڑھ کر جو آملے کے فائدے گنانے شروع کئے تو جی، جی کہہ کر ٹھاکر منونت سنگھ پر کچھ غنودگی طاری ہونے لگی۔ اتنے میں ٹھاکر صاحب نے جھاڑی کے نیچے ایک ریچھ دیکھا۔ اور مارے خوشی کے پھر اپنی رائفل سیدھی کی کہ یکایک اپادھیائے جی نے زور سے چلا کے کہا۔ "ہاتھی روکئے، ہاتھی روکئے!"

ٹھاکر سونت سنگھ نے دانت پیس کر اپنی رائفل نیچی کر لی اور بولے "نیچے تو ریچھ ہے"

پادھیائے جی ہنس کر بولے "نہیں ٹھاکر جی نیچے ایک بوٹی ہے نہایت نایاب بوٹی مجھے نظر آگئی ہے۔ دیکھئے وہ ہاتھی کو روکئے۔ نیچے اُتر کر آپ کو دکھاتا ہوں"

جب تک ریچھ بھاگ گیا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے دل ہی دل میں تو جانے کیا کچھ کہا ہوگا۔ مگر بظاہر بڑے تحمل سے ہاتھی رکوایا۔ اپادھیائے جی نیچے اترے اور ایک سوکھی سڑی جھاڑی کے پاس جا کر رک گئے اور بولے "دیکھئے یہ ہے وہ نایاب بوٹی! یہ سنگھار ل بوٹی ہے جسے پراکرت میں سکھارل کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ڈک مارل، یونانی میں جکین قطوط لاجواب بوٹی ہے۔ اس کی جڑ کو اگر تین سال آملے کے رس میں بھگو کر تپ دق کے مریض کو کھلایا جائے۔ تو وہ دو دن میں اچھا ہو جائے"

ٹھاکر سونت سنگھ کے دل میں خیال آیا کہ تین سال تک یعنی جب تک یہ بوٹی آملے کے رس میں بھیگتی رہے گی۔ اس وقت تک تپ دق کا مریض کیا کرے گا۔؟ مگر وزیروں سے اس طرح کے سوال کرنا قومی حمیت کے خلاف ہے۔ بلکہ سوال نہ کرنا ایک طرح کی قومی بحث ہی ہے۔!

سات دن کے دورے کے بعد شری اپادھیائے جی ترائی کے جنگلوں سے واپس آ کر پھر تین تال میں ٹک گئے۔ ان کی صحت بہتر ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہلدی، زیرہ، آملہ، بنفشہ اور اسی قسم کی سوڈیڑھ سو نایاب بوٹیاں اکٹھی کر لی تھیں۔ ٹھاکر سونت سنگھ کا ٹرپ بھی کامیاب رہا وزیر صحت کی مداخلت بیجا کے باوجود انھوں نے دو چیتے شکار کر لئے تھے

مسٹر اپادھیائے جی ٹھاکر منوت سنگھ کے کام سے بے حد خوش ہو کر بولے۔ "ٹھاکر جی آپ کو یہاں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے؟"

ٹھاکر جی بولے "حضور سب ٹھیک ہے، سب اچھا ہے، سب بہت ہی اچھا چل رہا ہے۔ بس ایک تکلیف ہے اور وہ یہ کہ تراٹی کے جنگل تو خود آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں۔ ان جنگلوں میں جب گھوڑے پر سوار ہو کر دورے کو جاتا ہوں تو سخت تکلیف ہوتی ہے"۔

"مگر مجھے تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی!" اپادھیائے جی حیرت سے بولے۔

"آپ تو ہاتھی پر تھے نا!" منوت سنگھ نے سمجھایا۔

"تو آپ بھی ہاتھی پر جائیے! کس نے آپ کو منع کیا ہے؟" اپادھیائے جی فوراً بولے۔

"کبھی کبھار اپنے رسوخ سے کسی راجہ مہاراجہ کا ہاتھی مانگ لیتا ہوں۔ مگر آپ جانتے ہیں وہ لوگ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ کبھی دیتے ہیں کبھی نہیں دیتے۔ ہاتھی تو دراصل سرکاری ہونا چاہیے"!

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں" اپادھیائے جی سر ہلا کر بولے "اتنے گھنے جنگلوں میں ہاتھی کے بغیر جانا سرکاری ملازم کو موت کے منھ میں دھکیلنا ہے۔!"

"بے شک، بے شک" ٹھاکر منوت سنگھ بے حد سنجیدہ ہو کر بولے۔

"ہاتھی کتنے کا آئے گا؟" آخر اپادھیائے جی نے سوچ سوچ کے پوچھا۔

ٹھاکر منونت سنگھ بولے۔ " اچھا ہاتھی دس ہزار میں آئے گا۔ مگر ان دنوں اتفاق سے راجہ آف بالمنی پور کا ایک ہاتھی پانچ ہزار میں مل رہا ہے۔ ! "

" آپ لے لیجئے۔ میں منظوری دیتا ہوں "

ٹھاکر جی نے کاغذات تو پہلے ہی سے تیار کر کے جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ فوراً آگے بڑھا دئے۔ خود اپنا قلم پیش کیا اور ایک لمحہ میں پانچ ہزار کا ہاتھی منظور ہو گیا۔

پھر ایسی دعوتوں، ٹی پارٹیوں کا سلسلہ چل نکلا اور کچھ اس طرح کی مصروفیت رہی کہ اگلے دس روز تک ابا دھیائے جی کو یاد ہی نہ رہا کہ وہ یہاں کس سلسلے میں آئے تھے۔ سوچتے ہی ان کے ماتھے پر پسینے کی دھاریں پھوٹ پڑیں۔ کیونکہ آدمی سیدھے تھے۔ اور نیک دل تھے۔ اور نہیں جانتے تھے کہ سرکاری کام کیسا مشکل کام ہوتا ہے۔ ناچار انھوں نے ٹیلیفون پر ٹھاکر صاحب کو بلایا۔ اور ان سے کہا کہ وہ اپنے مقامی محکمے کے ملازموں کی تفصیل لے کر آئیں۔ قومی بچت کی جائے گی۔

رات کو ٹھاکر صاحب اپنے محکمے کی تفصیل لے کر پہنچ گئے۔ شری ابا دھیائے جی نے تفصیل دیکھ کر کہا۔ " آپ مجھے زبانی سمجھائیے "

" دیکھئے ایک تو میں ہوں " ٹھاکر منونت سنگھ بولے " آپ مجھے نکال سکتے ہیں "

ابا دھیائے جی مسکرا کر بولے۔ چلئے، چلئے، ایک آدمی کو نکال کر کیا ہو گا ؟ "

" میرے دو ڈپٹی کنسرویٹر ہیں۔ جو چھ جنگلوں کو سنبھالتے ہیں "

"باپ رے۔ پھر تو ان کے پاس بہت کام ہوگا۔ آگے چلئے۔ میرا مطلب ہے۔ نیچے چلئے"

"نیچے چار اسسٹنٹ ڈپٹی کنسرویٹر"

"اور نیچے؟"

"بارہ رینج آفیسر"

"اور نیچے"

"اٹھائیس فارسٹ آفیسر"

"اور نیچے"

"ساٹھ فارسٹ گارڈ"

"اور نیچے"

"سات ریکارڈ کلرک"

"اور نیچے"

"بلی کا دودھ ۔ نو روپے"

اپادھیائے جی یکایک رک کے ۔ بولے۔ "ہائیں ! یہ بلی کا دودھ کس لئے؟"

ٹھاکر ہنومنت سنگھ نے بڑی سنجیدگی سے تشریح کی۔ "دیکھئے حضور! ہمارے ریکارڈ آفس میں چوہے بہت ہیں۔ جو قریب کے جنگل سے آتے جاتے ہیں۔ اور ریکارڈ تلف کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے سرکاری طور پر ہم نے ایک بلی پال رکھی ہے جو ان چوہوں سے ہمارے ریکارڈ کو بچاتی رہتی ہے۔ اس کے دودھ پر نو روپیہ ماہانہ خرچ ہوتے ہیں اور بس!"

اپادھیائے جی نے ایک دم غصے سے بھڑک کہا "مگر جب سات ریکارڈ کلرک ریکارڈ کو محفوظ کرنے کے لئے مامور ہیں۔ تو پھر اس بلی

کی کیا ضرورت ہے؟ لو دو بے!۔ نو دو بے!! . . . . . حیرت ہے ٹھاکر صاحب! آپ اتنے جہاندیدہ اور تجربہ کار آفیسر ہو کر یہ نہیں دیکھ سکے کہ آپ کی آنکھوں کے سامنے قوم کی گاڑھی کمائی کا قیمتی سرمایہ ایک جنگلی بلی کو دودھ پلانے میں صرف ہو رہا ہے۔!"

ٹھاکر صاحب نے شرم سے سر جھکا لیا۔

اپادھیائے جی فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ "میں حکم دیتا ہوں کہ اس بلی کو آج ہی سے ڈسمس کر دیا جائے"

"بہت بہتر" ٹھاکر منونت سنگھ فائل بند کرتے ہوئے بولے۔

یکایک دروازے کے قریب سے ایک باریک سی آواز آئی اور اپادھیائے جی اپنی کرسی سے اچھل پڑے۔

"میاؤں"

دروازے پر ایک بلی کھڑی تھی اور حیرت سے وزیر کو دیکھ رہی تھی ـــــ!

چینی پنکھا

میں نے شادی نہیں کی۔ زندگی میں مجھے عورت سے کبھی محبت نہیں ہوئی۔ صرف ایک بار ایک لڑکی مجھے ذرا پسند آئی تھی۔

میں نے اسے پہلی بار لیطراش رستوران میں دیکھا تھا وہ وہاں پر ویٹرس کا کام کرتی تھی۔ لیطراش رستوران بمبئی میں پہلا رستوران تھا جس نے بیرہ گیری کے کام کے لئے عورتیں ملازم رکھی تھیں۔ ہلکے گلابی فراک میں ملبوس سبک اندام لڑکیاں پھولوں کی طرح مہکتی ہوئیں ایک ٹیبل سے دوسری ٹیبل تک چلی جاتی تھیں۔ ان کی خوبصورت مسکراہٹیں، رنگین ناخن اور جگمگاتے ہوئے چہرے رستوران کو ہر روز مقبول تر بناتے جا رہے تھے۔ میں بھی وہیں پہنچا، جہاں ہر بوالہوس پہنچتا ہے۔ وہاں پر میں نے پہلی بار سریتا کو دیکھا۔

اس کے بال خشک اور بکھرے ہوئے تھے اور اس نے انھیں پیچھے سے کس کر ان کی پونی ٹیل بنا ڈالی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک نہیں تھا۔ لپ اسٹک نہ ہونا کوئی بات نہیں تھی۔ مگر مسکراہٹ بھی تو نہیں تھی۔

رنگ ایسا کھلتا ہوا تھا گویا کسی نے نربدا کی سنگ مرمر کی پہاڑیوں سے تراشا ہو۔ اس کا گلابی فراک اس کے جسم پر بالکل پھیکا معلوم ہوتا تھا۔ مگر میرا خیال ہے لوگ اس کا رنگ دیکھنے کے لئے نہیں آتے تھے۔ اس کی چال دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ اس کی چال میں شاعرانہ تمکنت کے ساتھ ایسی بحتی آوارگی تھی کہ اسے دیکھ کر بیک وقت کلوپیٹرا اور مارلن منرو کا خیال آتا تھا۔ جب وہ آرڈر لیکر چلتی تھی تو مرد اس حسرت سے اس کی پشت کو دیکھتے تھے کہ جیسے وہ کسی عورت کو نہ دیکھ رہے ہوں، تاج محل کو دیکھ رہے ہوں۔

جب وہ اپنے مخصوص نک چڑھے انداز میں میرا آرڈر لے چکی۔ تو میں نے اس سے کہا۔

"تم مسکراؤ گی نہیں؟"

"کیا یہ بھی آرڈر میں شامل ہے؟" اس کی اچٹتی ہوئی نگاہ میرے سر کے اوپر کہیں چلی گئی۔

"آرڈر میں تو نہیں آداب میں شامل ہے!"

اس کے ہونٹ اپنی جگہ پر ذرا سے ہلے۔ ایسے غصیلے، خمیدہ، پتلے ہونٹ تھے وہ پاگل بنا دینے والے۔ ان ہونٹوں کی ہنسی کیسی جان لیوا ہوگی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا اور اس سے کہا "اس وقت تمہارے ہونٹ ہملیٹ کی طرح سوچ رہے ہیں۔ میں مسکراؤں کہ نہ مسکراؤں؟"

"افسوس ہے کہ آپ ہملیٹ نہیں ہیں!" اس نے بڑی نخوت سے کہا۔

"تم کون سی ادائی لیا ہو؟" میں نے فوراً گستاخی سے جواب دیا۔

اس کی اُچٹتی ہوئی نگاہ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں میں واپس آئی۔ وہاں پر اس نے کچھ ڈھونڈا۔ دوسرے لمحے میں وہ پشت پھیر کر واپس چلی گئی۔ معلوم نہیں اُسے میری آنکھوں میں کچھ ملا کہ نہیں ملا۔ مجھے اس کے مستانہ خرام میں بہت کچھ مل گیا۔

آپ کو چوکنا نہیں چاہئے میں شریف آدمی نہیں ہوں میں نے آج تک شادی نہیں کی، کبھی کسی عورت سے محبت نہیں کی۔ اسی لئے اچھے اخلاق پر میں آپ کا لیکچر سننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

جب وہ تھری ان ون آئس کریم کی پلیٹ میرے سامنے رکھ چکی تو بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس رستوران میں بالعموم جتنے مرد آتے ہیں وہ آئس کریم کھاتے ہیں۔ اور جتنی عورتیں آتی ہیں وہ کافی آرڈر کرتی ہیں؟"

میں نے کہا "اس لئے کہ مرد کافی ہوتے ہیں اور عورتیں آئسکریم"

وہ برجستہ بولی "میرے خیال میں مرد ناکافی ہوتے ہیں"

میں بھناکر اسے کچھ کہنے ہی والا تھا۔ مگر وہ مسکرا کر پلٹ گئی۔ بڑی ہی تلخ اور زہریلی مسکراہٹ تھی وہ۔ یہی مسکراہٹ تو میں دیکھنا چاہتا تھا ——— ان لبوں کا زہر بھی اگر پینے کو مل جائے ——— میں نے ایک لحظے کے لئے اپنے دل میں سوچا۔ پھر اس خیال کو اپنے دل سے مٹا دیا۔ ہونہہ! کیا بیہودہ خیال ہے۔ عورت سے آئس کریم بہتر ہے کیونکہ آئس کریم تو ختم ہو سکتی ہے لیکن عورت کبھی نہیں ختم ہوتی۔ یقین نہ ہو تو ایک دفعہ آرڈر کر کے دیکھ لو۔۔!

میں نے اپنی کھوپڑی کو بڑی شفقت سے تھپتھپایا۔ شاباش تم بڑے عقل مند دماغ ہو، بہت عمدہ بھیجہ رکھتے ہو، تمہارے ہوتے ہوئے کوئی عورت مجھ پر قبضہ نہیں کر سکتی۔ !

میں آئس کریم کھا کر لیطراش رستوران سے چلا گیا اور دوبارہ کبھی وہاں نہیں گیا۔

کوئی چار ماہ کے بعد میری ملاقات پھر سریتا سے ہو گئی۔ کف پریڈ کے قریب سمندر کے کنارے ایک بہت بڑا اکشتی نما رستوران کھلا تھا جس میں نوجوان لڑکیاں جہازیوں کا سا لباس پہنے ہوئے بیرہ گیری کرتی تھیں۔

”ہائی سلیر!“ میں نے سریتا کو دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔ ”بیر کا ایک گلاس لاؤ“ آس پاس کے لوگ ہنسنے لگے کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ پر وہنبش ہے۔ میں تو سریتا کی ہنسی دیکھنا چاہتا تھا۔ ورنہ معلوم تو مجھے بھی تھا۔

مگر سریتا میرا جملہ سن کر بھی بالکل نہیں ہنسی۔ وہ میرے ٹیبل پر بھی نہیں رکی۔ بلکہ دوسری ٹیبل سے آرڈر لینے چلی گئی۔ اور میرے ٹیبل پر کوئی دوسری ہی لڑکی آ گئی۔ بڑی دلنواز لڑکی تھی یہ بے حد نرم اور دلربا۔ چال بھی اچھی، ادا بھی اچھی، مسکراہٹ بھی اچھی۔ ہر پہلو سے سینما کے اشتہار کی طرح مکمل۔ ایر ہوسٹس کی طرح ماستے لبریز۔ وہ اپنے ہاتھ میں پلاسٹک کی جلد میں ملفوف مینو لئے میرے ٹیبل پر جھک گئی۔ !

میں نے اس سے کہا ”میں آرڈر دے چکا ہوں“

"کسے؟"

"وہی جو تمہارے ہوٹل میں سب سے بد دماغ لڑکی ہے اُسے آرڈر دے چکا ہوں!"

اس نے ایک لمحے کے لئے سریتا کی پشت کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف اس نے بڑی ادا سے ایک جگمگاتی ہوئی روشن مسکراہٹ اس طرح پھینکی جیسے دیوالی کی رات میں بچے ایک دوسرے پر پھلجھڑی پھینکتے ہیں۔ وہ مسکراہٹ کہہ رہی تھی۔ اخاہ! میں سب جانتی ہوں۔

ہر عورت یہی سمجھتی ہے کہ وہ مردوں کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ مگر یہ نہیں جانتے ہیں کہ وہ کیا جانتی ہے۔ بھلا مچھلی سمندر کے بارے میں کیا جان سکتی ہے؟

تھوڑی دیر کے بعد سریتا میری ٹیبل پر آئی۔ بولی "مائی بولی ہے تم نے مجھے آرڈر دیدیا ہے مگر میں نے تمہارا آرڈر نہیں لیا۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔ میں اب عرض کرتا ہوں۔"

"فرمایئے" وہ ہمیشہ دو ویٹرس کی طرح مودب انداز میں میری میز پر جھکی۔ اس کی شفاف جبیں پر سو بل تھے!

میں نے کہا۔ "مجھے ایک فراخ مسکراہٹ چاہیئے، سفتے میں تلی ہوئی!"

وہ چونکی۔ چونک کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کی شفاف جبیں کے ٹیڑھے تیور بھی غائب ہو گئے۔ اب اس کے ہونٹوں پہ ہری نرخند

ہنسی آئی جو مجھے اس قدر پسند تھی۔

میں نے انُس سے پوچھا "اس ریستوران کے گاہکوں کو تمہاری کون سی ادا پسند ہے ؟"

"وہی میری آوارہ چال ! کیسی گندی نظروں سے میری پشت کی طرف دیکھتے ہیں" سریتا خفا ہو کے بولی "حالانکہ نطشے عورت کے بے ہنگم دھڑ کے بارے میں اتنا کچھ کہہ گیا ہے"

میں نے پوچھا "تم نطشے اور شیکسپیر پڑھ کر بھی اس ریستوران میں نوکری کرتی ہو ۔ کیوں ؟"

جواب میں وہ بولی "کہیے تو آپ کا بھیجہ فرائی کرلاؤں۔ بہت لذّہ لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے"

میں نے مربیانہ انداز میں کہا "میرا خیال ہے میں تم میں دلچسپی لے سکتا ہوں۔ تم مجھے ایسی عورت معلوم دیتی ہو جس سے آدمی بور ہوئے بغیر دس منٹ بات کر سکتا ہے۔ کرسی کھسکالو اور میرے قریب بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے آئین سٹائن کا فلسفہ اوقات پر بحث کروں گا۔ جس میں وہ کہتا ہے کہ اگر ہم زمین سے مریخ تک روشنی کی رفتار سے اُڑیں تو وقت آدھا رہ جائے گا اور ہمارے دل کی دھڑکن بھی آدھی ہو جائیگی ۔ اور ———"

"اور اگر میں آپ سے اسی طرح باتیں کرتی رہی تو منیجر کے دل کی دھڑکن بالکل ہی ختم ہو جائے گی" وہ طنزاً بولی "اب آپ مجھے ایک لمبا سا آرڈر دیدیجیے" وہ پنسل کی نوک پیڈ پر رکھتے ہوئے بولی ——

شام کے آٹھ بجے کے قریب میں اپنی گاڑی لے کر کف پریڈ پوائنٹ پر پہنچ گیا۔ مجھ سے پہلے چار گاڑیاں اور کھڑی تھیں اور اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سریتا گشتی نما ہوٹل سے باہر نکلی۔ اب ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اودے رنگ کی کنجی درم کی ایک عمدہ ساڑی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں بانس کی کھپچیوں کا بنا ہوا شانتی نکیتن کا منقش بیگ پاؤں میں سورت کے سنہری سینڈل۔ پونی ٹیل غائب تھی۔ سیدھی مانگ اور چمپا کی دیتی سے مہکتا ہوا جوڑا۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک کا جگمگاتا ہوا رنگ اور ایک میٹھی، مہربان۔ معصوم مسکراہٹ!

اُس نے باہر نکل کے چند لمحوں کے لئے اپنا ہینڈ بیگ جھلایا۔ پانچوں گاڑیوں کو دیکھا۔ آخر وہ شرماتے لجاتے ساڑی کا پلّو ٹھیک کرتے ہوئے میری گاڑی کے پاس آئی۔ اور سمٹ کر میرے پاس بیٹھ گئی اور مسکین لہجے میں بولی۔ "چلئے"

کیسا نرم اور ملائم لہجہ تھا۔ بالکل پلاسٹک کا بنا معلوم ہوتا تھا۔ "یہ کیسی سریتا ہے" میں سوچنے لگا۔

سریتا نے شرما کر آہستہ سے میرے کوٹ کے کالر کو چھوا اور دھیرے سے بولی۔ "اب چلئے بھی! مجھے ان مردودوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ دیکھئے کس طرح یہ چاروں گاڑیوں والے مجھے گھور رہے ہیں جلدی چلئے پران ناتھ!"

"پران ناتھ" پر میری ہنسی نکل گئی۔ کم بخت بہت عمدہ ایکٹنگ کرتی ہے۔ ہم دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی

بڑھاپے کے لئے کہا۔

گاڑی شہر سے باہر سڑک پر جارہی تھی اور گو سمندر کے کنارے کنارے جارہی تھی لیکن پھر بھی اکتوبر کی حبس سے جان جھلستی جارہی تھی۔ بمبئی میں اکتوبر کے مہینے میں جیل خانے کی سی گرمی ہوتی ہے۔

"ہم لوگ کہاں جارہے ہیں؟" سریتا نے لاپروائی سے پوچھا اور کچھ اس انداز سے پوچھا۔ گویا کہہ رہی ہو کہ اگر ہم جہنم میں بھی چلے جائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

میں نے کہا "دہار لیک پر چلوگی؟"

وہ دفعتاً چونکی "دہار جھیل پر کیا ہے" اس نے پوچھا۔

"کسی جگہ پر بھی کیا ہے؟" میں نے جواب دیا۔ "اور ہر جگہ سب کچھ ہے"

"کسی جگہ پر بھی کچھ نہیں ہے!" اس نے بڑی آزردگی سے کہا۔ اور عقب سے گدّوں کا سہارا لیکر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا "وہاں پر ایک جھیل ہے، جھیل میں پانی ہے، پانی میں کشتی ہے۔ کشتی میں دو دل ہیں"

"دو دلوں میں راکھ ہے، راکھ میں چنگاری ہے!" وہ میری بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "چنگاری میں آگ ہے۔ آگ دل کو جلاتی ہے"

میں نے کہا "اور جھیل کے قریب ایک ڈاک بنگلہ ہے اور کل ا... رہے!"

وہ بولی "میں آج تک کسی ڈاک بنگلے میں نہیں رہی۔ ڈاک بنگلہ؟

۔۔ ہے، ۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پوسٹ آفس کا چھوٹا سا بنگلہ ہو۔

میں نے جواب دیا "کوئی مضائقہ نہیں۔ قریب کی پہاڑی پر میرے ایک دوست آنند کا بنگلہ ہے۔"

وہ پھر چونکی۔ گویا اپنے دل سے پوچھ رہی ہو۔ اب کیا بہانہ کروں بولی "کون آنند؟"

میں نے کہا "دھرم پال آنند، تم اُسے نہیں جانتی ہو۔ اس نے ایک مشہور فلم ایکٹرس سے شادی کر رکھی ہے جس کے پاس بلیک کا ساٹھ لاکھ روپیہ ہے اور عمر صرف پچاس برس ہے۔ لیکن دھرم پال آنند اپنی بیوی سے بے حد پیار کرتا ہے۔ تم دھرم پال آنند کو دیکھو گی تو حیرت میں رہ جاؤ گی، بالکل کھانڈ کا بنا ہوا خوبصورت لڑکا ہے اسے دیکھتے ہی انسان کہہ اٹھتا ہے۔ کیا کوئی مرد بھی اتنا خوبصورت ہو سکتا ہے؟"

واقعی وہ خوابوں میں کھو گئی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے اسے بہت دیر تک خاموش دیکھ کر کہا۔

"کچھ نہیں،" وہ چونک کر بولی اور یکایک اس کی بشاشت عود کر آئی۔ وہ میری طرف جھبتی ہوئی شریر نگاہوں سے دیکھ کر بولی "اچھا بتاؤ۔ تم کام کیا کرتے ہو۔ اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام جیون ہے میں ——— پہلے ——— ایک اخبار میں رپورٹر تھا۔ اور بھوکا مرتا تھا۔ اب میرے پاس ایک

گاڑی ہے اور میں سونے کی سمگلنگ کرتا ہوں۔"

سریتا بولی "یوں کہو۔ اب میں سونے کی سمگلنگ کرتا ہوں اور میرے پاس ایک گاڑی ہے"

میں غصے میں بولا۔ "مگر میرا دھندا بالکل صاف اور ایمانداری کا دھندا ہے۔ میں باہر سے جو سونا منگاتا ہوں وہ مجھے یہاں ساٹھ روپے تولا پڑتا ہے۔ نوّے روپے میں اسے آگے بیچ دیتا ہوں، سیدھا صاف دھندا ہے کوئی کھٹ پٹ نہیں۔ نہ کسی کو رشوت دوں نہ کسی کے گھر ڈاکہ ڈالنے جاؤں۔ اپنا کام خود کرتا ہوں۔ جب جیل جاتا ہوں خود جیل جاتا ہوں کسی دوسرے کو جیل نہیں پہنچاتا"

"کتنی بار جیل جا چکے ہو؟"

"دو بار!"

"ویری گڈ۔ بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو"

میں نے پوچھا "وہ چار گاڑیوں والے کون تھے؟"

سریتا نے کہا "مت پوچھو۔ زندگی بڑی پیچیدہ ہے"

میں چپ رہا۔ مجھے پوچھ [illegible] ت بھی کیا تھی۔ میں نے چیلدوں کو زک دی تھی۔ سریتا میری گا[illegible] یں ہے۔ میں کسی کی کیا پرواہ کرتا ہوں۔ اب میں سریتا [illegible] پرواہ کرتا [illegible]۔ کم بخت کس آسانی سے میری گاڑی میں چل [illegible] ی۔ اتنی آسان [illegible]۔ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ دو چار دن اِس نے مجھے چلایا [illegible] ے ہوتے، [illegible] خرچ کروا دیے ہوتے تو مزہ بھی آتا۔ یہی احمق [illegible] ملاقات ہی میں گاڑی میں بیٹھ کر چلی آئی۔ یہ بیچاری کبھی آخر عورت [illegible]

مجھے سریتا پر رحم آنے لگا۔ میں نے اپنا بازو اس کی لپشت کی طرف بڑھایا۔ سریتا آگے کو جھکی ہو کر بیٹھ گئی۔ پھر اُس نے اپنا بیگ کھولا اس میں سے ایک دستی پنکھا نکالا۔ اور اسے کھول کر جھلنے لگی۔

"اوہ بڑی گرمی ہے!" وہ پنکھا جھلتے جھلتے بولی۔

یہ ایک سبک خوشنما دستی چینی پنکھا تھا۔ صندل کی لکڑی کا بنا ہوا۔ سمٹ کر دو انگلیوں میں آجاتا تھا اور پھیل کر پورے چہرے کو ڈھک لیتا تھا۔ یکایک سریتا نے ایک ادا سے اس چینی پنکھے کے پیچھے اپنا چہرہ چھپا لیا اور اس کی شربتی نگاہیں میرے دل وجگر کو برمانے لگیں۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ سریتا نے فوراً وہ پنکھا کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ بولی۔

"دیکھو! اس پر کیا لکھا ہے؟"

میں نے چینی پنکھا اپنے ہاتھ میں لیا۔ اسے سونگھا۔ صندل کی ہلکی ہلکی مہک اس کے ریشے ریشے سے آتی تھی۔ آخری دو دستوں پر دو تصویریں کھدی تھیں۔ ایک طرف ایک پہاڑی کے نیچے ایک چینی مرد کھڑا تھا۔ دوسری طرف ایک عورت چھتنار کے نیچے کھڑی تھی بیچ کے نازک منقش دستوں پر چینی زبان میں ایک عبارت کندہ تھی۔

"کیا تم پڑھ سکتے ہو اِسے" سریتا نے مجھ سے پوچھا "اس پنکھے پر یہ کیا عبارت لکھی ہے؟"

میں نے کہا "جانِ من! میں اسے پڑھ تو نہیں سکتا لیکن سونگھ سکتا ہوں" میں نے چینی پنکھے کو زور سے سونگھتے ہوئے کہا "ہائے! مجھے تو یہ محبت کی کہانی معلوم ہوتی ہے"

سریتا بولی۔ "جب تک وہاں لیک پر تمہارے دھرم پال آنند کے گھر پر پہونچتے ہیں۔ آؤ اس محبت کی کہانی کو پڑھ جائیں۔ میں عورت بنتی ہوں۔ تم مرد بن جاؤ!"

"بن جاؤ" کا کیا مطلب؟ میں تو مرد ہوں جیسی تم عورت ہو"

سریتا نے لکڑی کے خوشنما دستوں پر انگلی پھیرتے ہوئے پوچھا "یہ عبارت دائیں سے بائیں چلتی ہے یا بائیں سے دائیں؟"

"اوپر سے نیچے" میں نے آہستہ سے کہا "یہ محبت کی کہانی ہے نا!"

سریتا ہنسی۔ ہنس کر اس نے اپنی انگلی عورت کی تصویر کے نیچے لکھی ہوئی عبارت پر رکھی، اور اسے نیچے گھماتے ہوئے بولی۔

"میں می ماؤ
خاؤ چانگ علاقے کی عورت
تنگ سنگ برڑ کے نیچے
جھیل کے کنارے تیرا انتظار کرتی ہوں"

میں نے مرد کی تصویر کے نیچے انگلی گھماتے ہوئے کہا۔

"میں کوا تنگ کے پہاڑوں کا مرد
اپنی برف بستہ چوٹیوں سے اتر کر جھیل کے جنگلوں سے گذرتا ہوا
رواں دواں ندیوں سے کھیلتا ہوا
جھیل کے اس کنارے پہنچتا ہوں۔
جہاں تو کھڑی ہے"

"تم کیوں آئے ہو مرد ؟ -
"تم یہاں کیوں کھڑی ہو عورت ؟"
"میں جھیل میں اپنی تیرتی ہوئی بطخوں کا رقص دیکھتی ہوں"
"اور میں جھیل میں تیرتے ہوئے تیرے چہرے کا عکس دیکھتا ہوں"
سریتا بولی "فاؤچنگ میں اخروٹ شہد کی طرح میٹھے ہیں"
"اور چاول کے دانے عورت کی انگلیوں کی پوروں کی طرح نازک اور حسین ہیں۔ فاؤچنگ کی جھیل کے حصے ختم ہیں۔
وہ موسم بہار میں تنگ کے درختوں پر سرخ پھول بن کر کھل جاتے ہیں —
فاؤچنگ کے ملاتے کی عورت اپنے گھر میں مطمئن ہے۔
اجنبی ! جھیل کا سپنا نہ دیکھ !
میں نے کہا "میرے وانتنگ کے پہاڑوں پر سدا برف رہتی ہے
طوفان کے جھکڑ چلتے ہیں۔
وہاں سرد چٹانیں ہیں۔ اور ننگے نوکیلے پتھر۔
میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے
نہ اخروٹ، نہ چاول۔ نہ جھیل نہ نغمے۔
پھر بھی میں جاؤ میں تیرا عکس دیکھتا ہوں۔
کیونکہ مجھے تجھ سے محبت ہے !
سریتا نے کہا
"اے اجنبی !"
میں تیرے لئے کوانتنگ کے برفیلے پہاڑ پر جاؤں گی"

اور طوفانی جھکڑوں کا سامنا کیا کروں گی۔
سرد چٹانوں پہ رہوں گی۔
اور نوکیلے پتھروں پر ننگے پاؤں چلوں گی۔
اور زندگی کے سرخ پھولوں کو اپنی کوکھ سے پیدا کروں گی۔
کیونکہ میں عورت ہوں!
یکایک سریتا نے دستی پنکھا بند کر کے اپنی گود میں گرا دیا اور دونوں
ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کے رونے لگی:۔

روتے روتے سریتا اور بھی دلکش ہو گئی۔ اس کے رخسار جذبات کی سرخی سے تمتمانے لگے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں لال ڈورے شفق کی دھاریوں کی طرح چمکنے لگے۔ اور بھیگی پلکوں پر آنسو شبنم کے موتیوں کی طرح جگمگانے لگے۔ میں نے اسے سہارا دیکر اپنے کندھے سے لگا لیا اور اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیکر اُس کے ہونٹوں کا سارا زہر چوس لیا۔ اب وہ ہونٹ کتنے نرم اور ملائم تھے۔ آنسوؤں کے دھارے میں عورت کتنی کمزور اور ملائم ہو جاتی ہے جیسے بارش میں بھیگ کر دھرتی نرم پڑ جاتی ہے۔ اُس وقت عورت کی کمزوری میں ایک عجیب و غریب خطرناک کیفیت بھی ہوتی ہے جس سے بچاؤ کی صورت مشکل سے سوجھتی ہے۔ میں تو روتی ہوئی عورت اور مسکراتے ہوئے بچے کو دیکھ کر اُس سے پیار کئے بغیر نہیں رہ سکتا ایسا احمق ہوں میں!

میں نے سریتا سے پوچھا "کچھ یاد آیا؟"

"رہگذر یاد آیا" وہ سر جھکا کے بولی۔

"تم عورتوں میں بس یہی خامی ہے" میں ذرا غصے سے بولا۔ ایسے نفسیاتی موقعے پر رو دیتی ہو کہ آدمی بالکل بے بس ہو جاتا ہے مجھے دیکھو: اچھا بھلا اپنی جگہ پر بیٹھا تھا تمہیں کسی طرح پریشان نہیں کر رہا تھا۔ مگر تم نے اپنی حرکت سے میرا زہد غارت کر دیا۔ بس اس لئے۔ مجھے تم لوگوں سے نفرت ہے۔"

میں اُس سے الگ ہو کے بیٹھ گیا۔ سچ مچ مجھے بہت غصہ آ رہا تھا۔

سریتا مسکرا کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ "تم نے بی۔ اے۔ کیا ہے؟"

وہ بولی "۔ بی۔ اے کیا ہے، اس کے بعد لا بھی کیا ہے۔"

"لا۔ کیا ہے تو وکیل کیوں نہ بن گئیں؟"

"اس دنیا میں انصاف کہاں ہے"؟ ۔ سریتا نے جواب دیا۔

"انصاف نہ سہی۔ وکالت میں تمہیں عزت تو ملتی"

"اس دنیا میں وہ عورت بڑی خوش قسمت ہوتی ہے جسے عزت ملتی ہے"

"اچھا چلو، عزت نہ سہی، پیسے ہی ملتے۔ اس بیرہ گری سے تو زیادہ ہی ملتے!"

"کیا بات کرتے ہو مسٹر؟ ——— تمہیں کچھ پتہ ہے؟" ——— سریتا غصے سے بولی "اس بیرہ گری میں معمولی سے معمولی طالب علم بھی جو کافی پینے آتا ہے۔ مجھے ایک روپے سے کم کا ٹپ نہیں دیتا، ایک

صاحب ہیں۔ وہ جب آتے ہیں پانچ روپے کا ٹپ دے کر جاتے ہیں۔ چاہے بل چھ آنے کا ہو۔ ایک بزنس مین ہے وہ گذشتہ پندرہ دن سے رات کو ڈنر کھانے آتا ہے اور سو روپے کا ٹپ ہر روز میرے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ ہر روز شام کے وقت اس کی گاڑی باہر میرا انتظار کرتی ہے۔ آج پندرہ روز ہو گئے!"

"پھر؟" میں نے پوچھا

"ابھی دو چار مہینے اس کی گاڑی اور انتظار کرے گی" وہ بڑی نخوت سے بولی۔ "میں تم لوگوں سے گن گن کر انتقام لوں گی"

"اب تک کتنے انتقام گن چکی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا

جملہ بہت تیز تھا اس کے لئے۔ اس نے زور کا دھپ میری پیٹھ پر مارا۔ پھر ایک اور دیا۔ پھر ایک اور دیا۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لئے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ جب جا کے وہ کہیں رُکی۔ اس دوران میں اس نے مجھے بہت سی بے ضرر سی گالیاں بھی دیں جنھیں میں نے ہنس کر سن لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بولی "سونے کے علاوہ کیا عورتیں بھی تم سمگل کرتے ہو؟"

میں نے کہا "ہر قیمتی چیز سمگل ہوتی ہے۔ چاہوں تو میں تمہیں اسی گاڑی سے جادو کے تاش کے پتے کی طرح غائب کر دوں اور صبح جب تمہاری آنکھ کھلے تو تم اپنے آپ کو بغداد کے کسی کوچے میں، روم کے کسی پیازا میں یا لوئس ایرز کے کسی کافے میں پاؤ گی!"۔

"یوں" میں نے چٹکی بجائی۔

"نہ بابا : " سریتا کے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی، میں یہیں ٹھیک ہوں "

گاڑی اب پہاڑ کی چڑھائی چڑھتے ہوئے اُدھر جا رہی تھی جہاں پر میرے دوست آنند کا گھر تھا۔ میں نے سوئچ دبا کر گاڑی کے اندر روشنی کی اور سریتا سے کہا "لپ اسٹک پاؤڈر کے اٹم غلم سے اپنے چہرے کی مرمت کر لو۔ آنند کا گھر قریب آ رہا ہے۔"

سریتا نے کمپیکٹ کھولا۔

بنگلے کے پورچ میں ہمیں آنند کا بیرہ مل گیا۔ اُس سے پوچھنے سے پتہ چلا کہ آنند کی بیوی تو گھر میں نہیں ہے۔ وہ نکھٹو فلم ایکٹرس تاج میں کسی پارٹی میں شامل ہونے کے نام ہی سے غائب ہے۔

" اور وہ نکھٹو کہاں ہے ؟" میں نے بیرے سے پوچھا۔

" کوئی نکھٹو صاحب ادھر نہیں آئے !" بیرے نے حیرانی سے جواب دیا۔

" ارے وہ لال بجھکڑ آنند کو میں پوچھتا ہوں "

" آنند صاحب تو اپنے بیڈ روم میں ہیں "

" کیا کر رہے ہیں؟"

" وہسکی پی رہے ہیں۔"

میں نے سریتا کو بازو سے گھسیٹ کر کہا " جلدی چلو سریتا ورنہ وہ کمبخت ساری بوتل ختم کر جائے گا!"

خوش رو، خوش اخلاق، خوش نصیب آنند اپنے کمرے میں اکیلا

وِھسکی پی رہا تھا۔ جب ہم اطلاع دیئے بغیر اس کے کمرے میں پہونچے تو وہ اپنا پیگ بنا کر اُسے ہونٹوں تک لے جانے والا تھا کہ وہ ہمیں دیکھ کر ٹھٹکا، چونکا ——— اس کا گلاس چھلک اس کے ہاتھوں سے گر کر فرش پر چکنا چور ہو گیا۔

میں نے ہنس کر کہا "ایسی پھٹی پھٹی نگاہوں سے کیا دیکھ رہے ہو۔ میں تمہارا دوست ہوں، جیون! جیون ! کوئی بھوت نہیں ہوں"

اس نے آہستہ سے کہا "ایک لمحے کے لئے میں بھی یہی سمجھا۔ میں کسی بھوت یا چھلاوے کو دیکھ رہا ہوں"

میں نے تعارف کرایا "یہ سریتا ہیں ——— یہ آنند ہیں"

آنند نے رک رک کر آہستہ سے پوچھا۔ یہ ——— یہ ——— تمہاری بیوی ہیں۔؟"

سریتا بڑی تیزی سے بولی "نہیں صاحب ! ——— میں ان کی محبوبہ ہوں ! ایک رات کی محبوبہ !"

اس کے بعد وہ بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی اور بولی۔ "ایک پیگ بنایئے !"

رات مدھم اور ملائم یوں دھیرے دھیرے گذر رہی تھی جیسے وِھسکی حلق سے گذرتی ہے۔ اس رات میں پرانے پھولوں کی خوشبو تھی۔ اور ایک افسردہ سا نشہ تھا۔ ہم تینوں خاموش تھے۔ اپنے اپنے خیالوں میں گم۔ اور اپنے اپنے پیالوں میں کھوئے ہوئے اور اپنے اپنے سپنوں میں سوئے ہوئے۔

یکایک سریتا نے چونک کر کہا۔ "وہسکی ختم ہوگئی"

آنند نے اُٹھ کر دوسری بوتل نکالی۔ سریتا بولی "اس بیڈروم میں بڑی گھٹن ہے۔ کہیں باہر نہ چلیں"

ہم لوگ وہسکی لئے باہر آگئے۔ اور بنگلے کی مغربی سیڑھیوں پر باہر بیٹھ گئے۔ میں اور سریتا پاس پاس بیٹھے۔ آنند ہم سے نیچے پتھر کے زینے پر یوں بیٹھا جہاں سے وہ ہم دونوں کو دیکھ سکتا تھا۔ سامنے سبز نوکیلے بالنسوں کا جھنڈ ایک چینی پنکھے کی طرح کھلا ہوا تھا۔ بالنسوں کے جھنڈ سے پرے ڈھلوان باغ تھا، جس کے نادیدہ پھولوں کی بھینی بھینی مہک ہمارے احساس میں گھلتی ہوئی۔ معلوم ہوتی تھی۔

"ابھی تھوڑی دیر میں چاند آئے گا!" آنند نے آہستہ سے کہا اور چپ ہوگیا۔ کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا

ایک لمبے وقفے کے بعد سریتا نے پوچھا "آپ کی اہلیہ محترمہ اب تک نہیں آئیں!"

"وہ دیر میں آتی ہیں"

"اور کبھی کبھی نہیں آتی ہیں؟" سریتا نے پوچھا۔

آنند نے اثبات میں سر ہلا دیا "ہاں کبھی کبھی نہیں آتی ہیں"

کیوں نہیں آتی ہیں؟" سریتا نے پھر پوچھا "فلم لائن سے تو مدت ہوئی وہ کنارہ کش ہو چکیں۔ اب کہاں جاتی ہیں؟"

"جانے وہ کہاں جاتی ہیں مگر مجھے وہسکی دے جاتی ہیں۔ یہ بنگلہ دے جاتی ہیں، کار دے جاتی ہیں"

"تم زندگی سے خوش ہو؟"

آنند نے ایک بہت بڑا گھونٹ پی کر کہا "بہت مدّت ہوئی یہ سوال میرے سامنے آیا تھا۔ خوشی یا دولت ؟ —— میں نے دولت کو چن لیا مجھے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"تم انسان ہو کہ سور ؟" یکایک سریتا چیخ اٹھی۔

آنند وسکی سے بھرا ہوا گلاس اُس کے مُنہ پر مارنے والا تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ آدھی سے زیادہ وسکی میرے ہاتھ پر چھلک گئی آنند پیچھے ہٹ گیا اور ہماری طرف پیٹھ موڑ کر بیٹھ گیا۔

میں نے سریتا سے کہا "یہ تمہاری انتہائی بدتمیزی ہے۔ شراب کے نشے میں تم اپنے آپ کو بھولتی جا رہی ہو"

"بھولنا چاہتی ہوں مگر بھول نہیں سکتی!"

"آنند سے معافی مانگو"

یکایک آنند اُٹھ بیٹھا۔ بڑی سختی سے بولا "نہیں نہیں! معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے ؟ میں جا رہا ہوں۔ آج رات کے لئے یہ گھر تمہارے حوالے ہے"

اس نے گلاس ختم کر کے گلاس کو بالسوں کے جھنڈ میں پھینک دیا۔ اور جلدی سے وہاں سے چلا گیا۔ میں نے اُسے روکنے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہیں رُکا۔ تھوڑی دیر میں اس کی کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ سریتا ہولے ہولے ہنسنے لگی۔ میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اور مت پیو، تم ہوش میں نہیں ہو"

آنند کی کار نیچے ڈھلوان سڑک پر اُترتی جا رہی تھی۔ کار کی پشت کی سُرخ بتّیاں کبھی درختوں میں چھپتیں کبھی سڑک پر چمکتی نظر آ رہی تھیں۔

پھر بتیاں دور چلی گئیں۔ پھر بتیاں گم ہو گئیں۔ پھر سڑک پر اندھیرے کے سوا کچھ نہ رہا۔

سریتا گھٹنوں میں منہ چھپا کے دھیرے دھیرے سسکنے لگی۔

یکایک نیم چاند بانسوں کے جھنڈ سے ابھر آیا اور بانس کی ایک شاخ کا سہارا لے کر سریتا کی طرف حیران و پریشان دیکھنے لگا۔

یکایک سریتا نے سر اٹھایا اور چاند کو شرربار نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ "کیا دیکھتے ہو میری طرف ؟ میری ہنسی اڑاتے ہو سالے دھوکے باز، جھوٹے، فریبی چاند ! "

سریتا نے گلاس کھینچ کر چاند کے منہ پر مارا۔ گلاس بانسوں کے جھنڈ میں جا گرا۔ ایک چھناکے سے اس کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ شاخیں اپنی جگہ پر ہلیں پھر ساکت ہو گئیں۔

سریتا گلوگیر لہجے میں بولی "کہیں کچھ ٹوٹتا ہے پھر بھی کچھ نہیں ہوتا۔ شاخیں ہلتی ہیں پھر اپنی جگہ پر ساکت ہو جاتی ہیں"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے اُسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ نشے میں اس کا منہ لال تھا اور اس کا سارا جسم بانس کی ٹہنی کی طرح کانپ رہا تھا۔ بیڈ روم کے قریب پہنچ کر وہ تڑپ کر میرے بازوؤں سے نکل گئی اور میری طرف انگلی اٹھا کے بولی

"میں اس بیڈ روم میں سوؤں گی تم اُس بیڈ روم میں"

"کیوں ؟ "

"میں آج رات اپنے غم کے ساتھ گذارنا چاہتی ہوں"

"تمہارا نام کیا ہے ؟"

"تمہیں کیوں بتاؤں، تم میرے کون ہوتے ہو ؟"

میں نے کہا "میں تو اس بیڈروم میں سوؤں گا"

سریتا نے شعلہ بار نگاہوں سے میری طرف دیکھ کے کہا "اگر تم انسان ہو تو دوسرے بیڈروم میں جا کے سوؤگے۔ اگر سور ہو تو میرے کمرے میں آؤگے!"

اتنا کہہ کر سریتا نے جلدی سے اپنے بیڈروم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

میں دھیرے دھیرے دوسرے بیڈروم میں جانے لگا۔

صبح ہوئی تو سریتا جا چکی تھی۔ ٹیبل پر ایک خط پڑا تھا۔ خط پر چینی بنکھار رکھا تھا۔ میں نے خط اٹھایا۔ لکھا تھا۔

"میں نے سوچا تھا۔ میں سب کچھ بھول چکی ہوں
مگر عورت بھلانے پر بھی کچھ بھول نہیں سکتی۔
ہر زخم اس کی رُوح میں ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔
کبھی مندمل نہیں ہوتا۔ سدا رِستا رہتا ہے۔
— آنند میرا شوہر ہے۔ اُس نے محبت کو
بیچ دیا اور دولت سے شادی کر لی۔ آج میں
اُس سے انتقام لینے آئی تھی مگر عین وقت پر
میرے اندر کی عورت نے میرا ساتھ نہ دیا۔
میرے خریدار میں تجھ سے معافی مانگتی ہوں!
میں بمبئی سے بہت دور جا رہی ہوں۔ ایک

چھوٹے سے دورافتادہ شہر میں میرا ایک بچہ
پل رہا ہے ۔ میرا اور آنند کا بچہ ۔ میں اس کے
پاس جا رہی ہوں ۔"

"سریتا"

کئی برس گزر گئے ۔ وہ چینی پنکھا آج بھی میرے پاس ہے ۔
اُسے کھولتا ہوں تو اُس میں سے آج بھی ایک انجانی سی مہک آتی ہے
پھر تیز اور سرد اور طوفانی ہوائیں چلنے لگتی ہیں ۔ اور کوئی بڑی دلدوز
گہری اور گمبھیر آواز میں مجھ سے کہتا ہے ۔

اے اجنبی
میں تیرے لئے کواتنگ کے برفیلے پہاڑوں پر جاؤں گی ۔
اور طوفانی جھکڑوں کا سامنا کروں گی ۔
سرد چٹانوں میں رہوں گی ۔
اور نوکیلے پتھروں پر ننگے پاؤں چلوں گی ۔
اور تنگ کے سرخ پھولوں کو اپنی کوکھ سے پیدا کروں گی ۔
کیونکہ میں عورت ہوں ۔

اشوک کی موت

سارے محل میں سنّاٹا تھا۔ سات دن اور سات راتوں سے اشوک بستر مرگ پر پڑا تھا۔ لیکن اُس کا دم نہ نکلتا تھا۔ اس کی ٹانگیں حرکت نہ کرتی تھیں۔ اس کا دھڑ حرکت نہ کرتا تھا۔ اُس کے بازو ہِل نہ سکتے تھے۔ صرف سانس کی حرکت باقی تھی۔ اور آنکھوں کی پتلیاں روشن تھیں۔ اور زبان دھیرے دھیرے کام کرتی تھی۔ شہر کے سارے وید اُس کا علاج کر چکے تھے۔ ہندوستان کے کونے کونے سے، برما سے چین سے، لنکا سے، سیام سے، ہند چینی سے بڑے بڑے دانشمند حکیم آئے تھے۔ غیر ملکوں کی حکمت اور اپنی زندگی کا سارا تجربہ اپنے ساتھ لائے تھے، لیکن اشوک پر کسی دوا کا اثر نہ ہوا۔ بیماری بڑھتی گئی۔ اور وہ موت کے گھاٹ اترتا گیا۔ آخر وہ وقت آیا جب ہر کسی نے جواب دیدیا۔ جب دوا دارُو والے۔ جنتر منتر والے، جھاڑ پھونک والے، سب لوگ نا امید ہو گئے اور ہر ایک نے کہہ دیا۔ مہاراج ادھیراج، اشوک اب بچ نہیں سکتے۔ اب ان کو جانا ہی ہوگا۔ اپنا محل، اپنا

ملک، اپنا دھرم، اپنا فلسفہ، گیان دھیان، اپنی پنچ شیلا، پتھر کے کتبے مینار۔ لاٹ، فتوحات، شہرت، رعایا۔ بچے بالے ہر چیز کو یہیں چھوڑ کے جانا ہوگا۔ کوئی یاد بھی ساتھ نہ جائے گی کیونکہ جب دم نکل جاتا ہے تو اس جیون کی ہر یاد اور اس زندگی کی ہر مسرت اور اس وقت کا ہر درد اور اس زمانے کی ہر ادا وہیں پر ختم ہو جاتی ہے اور آدمی وہیں پہ پہنچ جاتا ہے جہاں سے وہ چلا تھا۔ صرف زمین ہی گول نہیں، صرف سورج ہی گول نہیں، صرف نظام شمسی اور یہ کائنات اور یہ وقت کا بہاؤ ہی گول نہیں ہے۔ انسان کی زندگی بھی گول ہے۔ ایک بہت بڑی گولائی کے اندر ایک نہایت چھوٹی سی، ذرّے سے بھی مختصر گولائی، اشوک اعظم تھے۔ لیکن موت سے بڑا کوئی اعظم نہیں ہے!

یہ بات تو نہیں ہے کہ اشوک کو اس کا احساس نہیں تھا وہ بدھ کے پجاری تھے اور موت سے بالکل نہیں ڈرتے تھے۔ لیکن نہ ڈرنے کی بات اور ہے اور مر جانا دوسری بات ہے! اور ان دونوں باتوں میں بہت بُعد ہے۔ اور اس بات کا پتہ زندگی میں نہیں چلتا۔ جب تک تنے میں رَس رہتا ہے پتے ہرے اور چکنے رہتے ہیں۔ شاخوں پر پھول اور پھل آتے ہیں، بُلبل نغمہ سرا ہوتی ہے۔ پرندے گھونسلے بناتے ہیں انسان سائے کی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اور درخت زندگی کی فتح اور اس کے غرور سے سرشار ہو کر آسمان سے آنکھیں ملا کر بات کرتا ہے اُس وقت اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس سرشاری اور سرمستی کی کیفیت میں بھی اُس کی ضد موجود ہے اور یہ ضد تنے کی پور پور میں اور زندگی کی رگ رگ میں رچی رہتی ہے۔ ہر عمل اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔

اشوک کو اس بات کا احساس تو تھا۔ لیکن انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ جب زندگی موت کی حدوں کو چھو لے گی تو یوں مچل مچل جائے گی اور امید کے آخری تنکے کو یوں دانتوں میں دبا کر مرنے سے انکار کر دے گی۔ کیا حاصل نہیں کیا میں نے ؟ کتنی بھرپور زندگی رہی ہے میری، کتنے خوبصورت طریقے کی جیا ہوں میں۔ انسانی تاریخ کے ہزاروں سال بہت ہی کم ایسے خوش قسمت انسانوں کو گنا سکتے ہیں، جو اپنی زندگی میں راجہ ہوتے ہوئے بھی دیوتا کی طرح پوجے گئے ہوں۔ وہ کون سی خواہش تھی میری جو پوری نہ ہوئی ہو۔ عزت، دولت، شہرت، محبت ہر البیرا کے ساتھ میری زندگی نے بھرپور رقص کیا ہے، دھرم، نیک نامی، روح کا وہ گہرائیاں جو بدھ کے عرفان نے مجھ کو دیا۔ جس کی جوت نہ صرف میں نے اپنے دل میں جگائی بلکہ چہار دانگ عالم میں پھیلائی۔ اس روشنی کو میں نے اپنی روح میں سمو کر جذب کر لیا۔ اس طرح سے میرا ہر عمل میری روح کی آواز بن گیا اور مجھے وہ مسرت اور خوشی اس دنیا میں ملی۔ جس کی لوگ جنت میں توقع کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے کیا چاہیئے۔ پھر بھی یہ زندگی ہے کہ اپنی بقا کے لئے لڑے جاتی ہے۔ یہ دم ہے کہ بے دم ہوتے بھی ھوٹنک کر قائم ہے۔ یہ جان نکلتی کیوں نہیں ؟ یہ حرکت بند کیوں نہیں ہوتی ؟ میری گردن کے حلقوں میں یہ اضطراب کیسا ہے ؟ بدھ نے مجھے نروان کا سبق دیا۔ پھر بھی مجھے نروان حاصل کیوں نہیں ہوتا۔ سات دن اور سات راتوں سے میں اس بستر مرگ پر تڑپ رہا ہوں۔ ٹانگیں کام نہیں کرتیں۔ بازو کام نہیں کرتے، تنے کا رس سوکھ گیا صرف آنکھوں میں روشنی اور زبان میں گویائی ذرا سی بس اس طرح باقی ہے جس طرح جڑ سے اکھڑے ہوئے سوکھے ہوئے درخت کی ٹہنی پر آخری دو پتے

ہرے رہ جاتے ہیں۔ اب ختم ہو جائے یہ زندگی، وہ رشتہ ٹوٹ جائے جو پتے کو شاخ سے باندھ کے رکھتا ہے اور میری روح ایک کھڑکھڑاتے ہوئے پتے کی طرح فضا میں پرواز کر جائے۔!! میرا ہر احساس آسودہ ہو چکا۔ عرفان کا ہر گوشہ میری نگاہوں میں آ چکا۔ اب کیا باقی ہے جس کے لئے یہ زندگی زندہ ہے۔ یہ آخری سانس سات دن اور سات راتوں سے کس لئے حلق میں اٹکا ہوا ہے ؟

اِن سات دن اور سات راتوں میں اشوک کے دماغ نے اِس اَمر پر بہت سوچا، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ جو سلطنت کے ہر کام گیان دھیان کی ہر گتھی خود سلجھا تا تھا۔ موت اور زندگی کی آخری حد پر کھڑا ہوا ایک کربناک تذبذب سے دوچار تھا۔

اُس نے اپنی پوری زندگی پر نگاہ ڈالی۔ چوکھٹے کی ہر کیل اپنی جگہ سلامت تھی۔ ہر چول اپنی جگہ ٹھکی ہوئی تھی، سلطنت کا ہر کام خوش اسلوبی سے ہو رہا تھا۔ اشوک نے پھر ایک بار دُہرایا۔ . . . .

« مہا منتری ! کیا تم نے میری شدید علالت کا اعلان کر دیا ہے؟ »

« ہاں مہاراج !»

« کیا جنتا جانتی ہے کہ اب مہاراج بچ نہ سکیں گے ؟ »

« ہاں مہاراج ! مگر —— »

« مگر کو جانے دو۔ . . . میں سمجھتا ہوں »

اشوک چُپ ہو گئے۔ پھر بولے۔

« میرا بیٹا بندوسار کہاں ہے ؟ »

« حضور وہ اپنے کمرے میں بیٹھے رو رہے ہیں »

"اگر وہ رو رہے ہیں تو اُنھیں رونے دو۔ لیکن اگر شطرنج کھیل رہے ہیں تو اُنھیں میرے سامنے بُلاؤ۔"

تھوڑی دیر کے بعد راجکمار بندوسار ہاتھ جوڑ کر اپنے پتا کے سامنے کھڑے تھے۔

"مہامنتری! تم نے اعلان کر دیا ہے کہ میرے مرنے کے بعد راجکمار بندوسار ہندوستان کے چکرورتی مہاراج ہوں گے؟"

"ہاں مہاراج! ہندوستان کے ہر شہر اور ہر گاؤں میں منادی کر دی گئی ہے۔ باہر ملکوں میں سفیر بھیج دئے گئے ہیں۔ جن راجکماروں سے بغاوت کا اندیشہ تھا، انھیں قید کر دیا گیا ہے۔"

"بندوسار تمہیں اِس مہامنتری سے تو کوئی خطرہ نہیں ہے؟"

"نہیں پتا جی! اِن کے گھر میں ایک بھی بالک نہیں ہے۔ یہ میری گدّی چھین کر کیا کریں گے؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو"

اشوک چُپ ہو گئے

تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے مہاپروہت کو بُلا کے پوچھا۔

"سب سامان تیار ہے؟"

"ہاں مالک! کاشمیر سے زعفران آیا ہے۔ کیرل سے صندل کی لکڑی آئی ہے، مگدھ سے گھی آیا ہے۔ گاندھار سے پھل آئے ہیں بنارس سے ریشم کا کفن آیا ہے۔ ہندو پروہت اور بدھ بھکشو بھگوان کے چرنوں میں آپ کی درازیٔ عمر کی دعا کر رہے ہیں"

"بہت خوب! تو اب مجھے مر جانا چاہیے۔ لیکن پھر بھی میں

کیوں نہیں ملتی ؟"

مہا روہت نے کہا "آپ نہیں مریں گے ۔ کلیان کاری بدھ کا آپکو آشیرواد ہے "

اشوک نے سر ہلا کے کہا ۔

" ہر آشیرواد کو ایک دن ختم ہونا ہے ۔ ہر طرح کا گیان اور فلسفہ اور دھیان ایک دن اپنی موت کو پہنچتا ہے ۔ اس سنسار میں ہر خیال کی موت ہے ۔ ایک دن وہ بھی بوڑھے ہو جاتے ہیں اور کفن پہنا کر جلا دیئے جاتے ہیں "

" لکھ لو ۔ لکھ لو ! مہا پروہت چلایا ۔ مہا اشوک کی بانی "

بھوج پتر پر ایک ادیب روتے ہوئے مہا پرش کی بانی لکھنے لگا ۔

اشوک گہری سوچ میں ڈوب گئے ۔

بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ مر گئے ہوں ۔ جسم ساکت، آنکھیں بند، ہونٹ بند، بازو اور ٹانگیں مُردوں کی طرح اکڑی ہوئیں، پورے جسم پر موت کی سی زردی اور سیاہی ۔

شاہی ویدوں نے آگے بڑھ کر نبض ٹٹولنا چاہی ۔ سات دن اور سات راتوں سے وہ لوگ اسی کمرے میں جاگ رہے تھے ۔ اور ایک پلک نہ سوئے تھے ۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور زبان پر کانٹے سے محسوس ہوتے تھے اور وہ اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ واقعی دل سے دعا کر رہے تھے کہ اس جسد خاکی سے دیکھیں کب جان نکلے اور کب گھر جا کر گہری نیندیں سو جائیں اس کا بھی گمان تھا کہ اگر دو چار روز اور اشوک مہاراج اسی طرح زندہ

ور مُردہ رہے تو اِن ویدوں میں سے کسی کا دَم نکل جائے گا۔
ایک شاہی وید نے نبض کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ اشوک نے دھیرے سے کہا۔

" رہنے دو۔ ابھی زندہ ہوں"

وید گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اشوک نے آنکھیں کھولے بغیر پوچھا۔

" اب کیا وقت ہو گا ؟"

سب سے بڑے وید نے کہا " سورج غروب ہو رہا ہے "
اشوک نے کہا۔ " مجھے جھیل پر لے چلو۔ شاید سورج کو جاتے دیکھ کر میرے دل میں بھی جانے کی خواہش اس شدت کے ساتھ اُبھر آئے کہ میں اِس جانکنی کی حالت سے گذر کر گویا سورج کے ساتھ ہی دوسری دنیا میں چلا جاؤں "

اشوک کے جسم کو شاہی رتھ میں لِٹا دیا گیا اور آہستہ آہستہ گھوڑوں کو دُلکی چلا کر اُسے جھیل کے کنارے لے جایا گیا۔

یہ جھیل ایک خوبصورت پہاڑی وادی میں تھی۔ جھیل کے بیچوں بیچ اشوک کا راج محل تھا۔ چاروں طرف جھیل کا پانی تھا۔ اور صرف مشرق میں ایک سڑک پہاڑ سے راج محل تک جھیل کو کشتیوں سے پاٹ کر بنائی گئی تھی۔

سورج ، لال بھبھوکا تھا۔ مغرب میں کانچ کی طرح سبک بادل سُرخ روشنی سے معمور جامِ شراب کی طرح چھلک رہے تھے۔ نور کا ایک سیلاب تھا کہ جھیل میں اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ محل کی برجیاں اور کلس سونے

کے پانی سے جگمگائے ہوئے ....

کس قدر خوبصورت ہے یہ دنیا! اشوک نے ایک آہ بھر کے سوچا اور اُسے یاد آیا کہ کبھی یہاں پر محل نہ تھا۔ کشتیوں کا پل نہ تھا۔ شہر نہ تھا۔ وہ خود اشوک آج کا اشوک نہ تھا۔ بائیس برس کا جوان شہزادہ تھا۔ جو شکار کی تلاش میں گھوڑے پر سوار دوڑتے دوڑتے اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر ادھر آ نکلا تھا۔ اسی طرح شام کا وقت تھا۔ سورج کے غروب ہونے میں بس یہی رعنائی تھی۔ صرف جہاں پر آج اس کا رتھ کھڑا ہے وہاں پر ایک ماہی گیر کا جھونپڑا تھا۔ اور ایک لڑکی اپنے باپ کے ساتھ جھیل میں جال کھینچ رہی تھی۔ اور اس کا سارا بدن ایک سنہری کمان کی طرح جھیل کے پانیوں پر کھنچا ہوا یوں ڈول رہا تھا۔ جیسے کنول کا پھول لہروں کے ہلکورے کھاتے ہوئے سطح آب پر رقص کرتا ہے۔

وہ رقص آج کہاں ہے؟ وہ مچھلی کدھر گئی، کس جھیل میں؟ ۔ کس تالاب میں یا کانچ کے کس پیالے میں رقص کر رہی ہے؟

اشوک نے آہ بھر کے کہا۔

"مجھے واپس لے چلو۔ یہاں آ کے تو میں جوان ہوا جاتا ہوں!"

آدھی رات ادھر گذر گئی۔

محل کی غلام گردشوں میں کافوری شمعیں روشن تھیں۔ اشوک کا کمرہ اگر اور لوبان سے مہکا ہوا تھا۔ دھیمے سُروں میں بھکشو پاٹھ کر رہے تھے۔ اشوک کے سر کے پاس ایک بڑی کھڑکی کھلی تھی کھڑکی کے آس پاس سنگیسر کے پیڑ کی ایک شاخ لال لال پھولوں

کی دیبی سی سجائے کھڑی تھی۔ اس دیبی کے پرے کھلے آسمان میں تارے گویا آنکھیں جھپک رہے تھے۔

کتنی خاموشی ہے۔ کتنا پیارا سناٹا ہے۔ اشوک نے سوچا اس شہد بھری غنودگی میں اگر کہیں سے ایک دھیما دھیما رقص شروع ہو اور میری زندگی اسی رقص کی تال پر چکر کھاتے ہوئے دھیمے دھیمے یوں غائب ہو جائے جیسے آسمان کی پہنائی میں اپسرائیں رقص کرتی ہوئی غائب ہو جاتی ہیں۔ تو کتنا اچھا ہو۔

اشوک نے حکم دیا اور رقص شروع ہو گیا۔

رقاصائیں کچی نیند سے جاگی تھیں۔ اس لئے ابھی تک ان کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ اور رقص اس طرح کا تھا جیسے ہر رقاصہ کا بدن ٹوٹ رہا ہو اور ٹوٹ کر انگڑائی میں منتشر ہو رہا ہو۔ تال میں اُن خوابیدہ جذبوں کی مہک تھی جو جوان رات کے بستر پر جاگ گئے ہیں۔ اُن رقاصاؤں کی ہر خم میں کس قدر خطرناک بلاوا ہے۔ ہر آرزو سیراب ہو چکی ہر ہوس آسودہ ہو چکی۔ اب جسم و جان میں عالم نشاط کی کوئی کیفیت باقی نہیں پھر بھی نگاہ کیسے رُک جاتی ہے۔ عورت کے خم میں کیسے اُلجھ کر رہ جاتی ہے۔ گیسوئے مشکبار گویا اپنی کالی آنکھوں سے میری طرف جھانکتے ہیں، اور اجنبی عطر کا پیام دیتے ہیں۔ اب بھی، آج بھی زندگی کے آخری دروازہ پر بھی، زندگی عورت کے فریب میں مجھے بُلاتی ہے؟

اشوک نے آہ بھری۔ " ایسے تو میں کبھی نہ مر سکوں گا" اس نے ہاتھ کے اشارے سے رقص روک دیا۔ تال سُر ہاتھ کی ایک حرکت سے بکھر گئے، ٹوٹ گئے۔ خاموش ہو گئے۔ رقاصاؤں کی

میٹھی میٹھی جھانجھروں کی صدا غلام گردشوں میں گونج گونج کر دب گئی اور پھر محل میں سناٹا چھا گیا۔

باقی رات اشوک نے انتہائی کرب میں گذاری اور جانکنی کے گہرے درد سے بے تاب ہو کر اس نے بار بار بھگوان بدھ سے التجا کی کہ وہ اسے نروان کا راستہ دکھائیں۔

اشوک نے ویدوں کے اصرار کے باوجود ہر قسم کی دوا لینے سے انکار کر دیا تھا۔ بے بس وید، منتری اور کرمچاری، محل کی رانیاں اور عورتیں، شہزادے اور جاگیردار ہاتھ باندھے محل کے اندر اور محل کے باہر زندگی اور موت کے اس معرکے کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ جنتا اپنے اپنے گھروں میں خوف و ہراس سے دبکی پڑی تھی۔ اُن کے کان شاہی محل کے گھنٹے کی طرف تھے جو اشوک کی موت کے اعلان کو سارے شہر میں پھیلا دے گا۔

لیکن ساری رات گذر گئی۔ اور اشوک نہ مرا، اُس کا بے کار، بے آسرا جسم موت اور زندگی کے تھپیڑوں میں ایک خستہ کشتی کی طرح ڈولتا رہا۔ نہ وہ ڈوبا نہ کنارے پر لگا۔ روح بار بار جسم خاکی سے ہجرت کر کے نکلنے کی کوشش کرتی۔ لیکن جانے وہ کیا چیز تھی۔ جو اُسے ابھی تک اُس کا ناکارہ جسم سے باندھے ہوئے تھی۔ بس صرف ایک تار تھا، ایک سانس تھا، ایک دھاگا تھا، دل کی ایک ہی دھڑکن تھی جو زندگی کو جسم سے الگ نہ ہونے دیتی تھی۔

جب صبح ہونے والی تھی تو اشوک نے اپنے آپ کو بڑا ہلکا محسوس کیا۔ اُس نے اپنے جسم و جان میں ایک عجیب سی تازگی کو محسوس کیا۔ سات

دنوں اور سات راتوں کے بعد آٹھویں صبح کو پہلی بار اُس کے نیلے ہونٹوں پر دروج کے چاند کی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اُس نے حکم دیا کہ اُس کا بستر باہر باغ میں سیب کے درخت کے نیچے بچھایا جائے وہ اپنی آنکھوں سے صبح دیکھے گا۔ رات کو جاتے اور دن کو آتے دیکھے گا شاید اِس آنے اور جانے کے دوران میں اس کی رُوح کو اس کشمکشِ حیات سے نجات مل جائے!

خدام نے اسی وقت اُس کے حکم کی تعمیل کی۔

ابھی صبح آئی نہ تھی۔ جب اشوک کا بستر شاہی محل کے پائیں باغ میں سیب کے پیڑ کے نیچے لگا دیا گیا۔ ابھی رات کا اندھیارا باقی تھا ابھی پرندے بولے نہ تھے، چڑیاں چہچہائی نہ تھیں۔ کوّوں نے پر پھڑپھڑائے نہ تھے۔ کلیوں نے آنکھ کھولی نہ تھی۔ عاشق نے اپنے محبوب کا سر اپنے کندھے سے نہ اُٹھایا تھا، اُس نیم اندھیارے میں اشوک سیب کے نیم تاریک سایوں میں پڑا پڑا موت کو آواز دینے لگا۔

اے رات! لطیف موت کے سُبک ساتھی مجھے اپنے ساتھ لے جا، اب یہ جانکنی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی، اے زمین سے اُٹھ کر آسمان کی طرف بھاگنے والے سائے! مجھے اپنے جھکتے ہوئے دامن میں چھپا لے، میری تھکی ہوئی آسودہ روح کسی نئے افق کی ناآسودگی بخش، کسی اور ترتیب میں، کسی اور صورت میں، کسی اور تجسیم اور تشکیل کے قالبوں میں مجھے ڈھال دے۔ مگر مجھے یہاں سے نکال لے جا۔ اِس آخری سانس کو میرے جسدِ خاکی سے یوں کھینچ لے جیسے مشتاق شکاری اپنے پاؤں سے کانٹا کھینچ لیتا ہے۔ پھر مجھے قرار آئیگا۔

پھر مجھے نیند آجائے گی۔

بہت دیر تک اشوک اسی طرح اپنے ہونٹوں میں بڑبڑاتا رہا۔

دیر تک محل کے مودب کرمچاری اس سے دُور ہٹ کر نگاہیں نیچی کئے، ہاتھ باندھے اسے سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے رہے، ہولے ہولے رات کی تاریکی ادھر اٹھتی گئی، سیاہی کے دھبّے سمٹتے گئے، سمٹ کر صورتیں اختیار کرتے گئے، صورتوں میں چمک آنے لگی، چمک میں حرکت پیدا ہوئی، کہیں پرکلی چٹکی، پتّوں کا جھرمٹ ہوا میں لہکا اور چشم زدن میں سیب کا سیاہ پیڑ سفید سفید پھولوں سے بھرا ہوا نظر آیا۔ فضا میں پرندوں کی چہکاریں سبک خرام بلبلوں کی طرح تیرنے لگیں۔ اور افق تا افق زمین اور آسمان روشنی سے منوّر ہو گئے۔

عین اسی لمحے باغ کے ایک کونے سے ایک زور کی چیخ سُنائی دی اور پھر کوئی بلبلا کر زور زور سے رونے لگا۔

اشوک نے پوچھا، "کون ہے؟"

خُدّام نے ڈرتے ڈرتے بتایا، "مالی کے گھر بچہ ہوا ہے۔"

"بچہ ہوا ہے۔ ؟ اُسے میرے پاس لاؤ۔"

وہ سہمی، بلکتی، جھپاتی ننھی سی جان جب اشوک کے سینے پر رکھی گئی تو ایک عجیب سی مُسکراہٹ سے اشوک کا چہرہ منوّر ہو گیا۔ مالی کا ننھا اشوک کے سینے پر چڑھ کر اپنے چاروں ہاتھ پاؤں بکبار گی چلاتے ہوئے حرکت کر رہا تھا۔ اور اشوک کے سینے سے دودھ ٹٹول رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن اس کا منُھ کھلا تھا اور وہ مضبوطی سے روتے ہوئے اپنے پیٹ کے لئے دُودھ اور اپنی زندگی کا حق مانگ رہا تھا!

اشوک نے دھیرے سے کہا۔ ٹھیک تو ہے اب میں سمجھا۔ کوئی آتا ہے تو کوئی جاتا ہے، کسی کے آنے کی اُمید نہ ہو تو کوئی جائے کیوں؟ اور اگر کوئی جائے گا ہی نہیں تو کوئی کیسے آسکے گا؟۔ یہ دنیا اگر ایسی سرائے ہوتی جس میں جانے کا کوئی دروازہ نہ ہوتا۔ صرف آنے ہی کا دروازہ ہوتا تو پھر ایک دن وہ آتا جب اِس میں کوئی نہ آسکتا۔ اِس لئے اب جانا ہی چاہیئے پھل جب پک جاتا ہے تو شاخ سے ٹپک پڑتا ہے اگر پھل ٹپکے گا نہیں تو دوسری بہار میں اس شاخ پر نئی کونپل کہاں سے آئے گی۔ اور کونپل پر نیا پھول کہاں سے آئے گا؟۔

اشوک نے پیار بھری نگاہوں سے ننھّے بچے کو دیکھا۔ ان نگاہوں میں اب کسی طرح کی حسرت نہ تھی۔ کسی طرح کا ملال نہ تھا۔ کسی طرح کی مایوسی نہ تھی۔

اشوک نے ننھّے سے آنکھیں پھیر کر سیب کے پیڑ کی طرف دیکھا اور دُور اوپر، دُور اوپر۔۔ دُور اوپر اس کی آنکھوں میں پھول ہی پھول کھلتے گئے احساس کے روئیں روئیں میں ایک اجنبی موسیقی کے بلاوے گونجنے لگے اور محراب در محراب آفاق کے نئے دروازے اور دریچے اُس کی رُوح کے لئے کھلتے گئے یکایک اُس نے اپنے پر پھیلائے اور سیب کے درخت سے بہت اوپر فضا میں اُڑ گیا!

ادم مسی بدمنی ادم۔

دیوا گیر گھنٹے بجنے لگے۔ کلسوں، برجوں، مناروں سے صدائیں بلند ہوئیں "مہاراج اشوک مر گئے"، مہاراج اشوک مر گئے" ۔۔ ماں نے دوڑ کر اپنے بچے کو اشوک کے سینے سے اٹھا کر اپنے سینے سے چمٹا لیا۔!

دِل کسی کا دوست نہیں

میں اور میرا دوست کا چرد جوہو کے نائس ہوٹل میں بیئر پی رہے تھے۔ ہمارے سامنے ساحل کے سامنے سمندر تھا۔ سمندر کی لہروں پر جھاگ تھا۔ بیئر کے گلاسوں پر بھی جھاگ تھا۔ آسمان پر ہلکے پھلکے اُڑتے ہوئے بادل مسرت کا کف معلوم ہوتے تھے۔ ساحل کی ریت پر کھڑا ایک گوانی سینی گیٹار بجا رہا تھا۔ اس کے قریب ایک نوجوان مرد اور عورت بانہوں میں بانہیں ڈالے ایک دوسرے کی آنکھوں میں ان سپنوں کو دیکھ رہے تھے۔ جو صرف جوانی میں کِھلتے ہیں۔ مضبوط اور سانولا لڑکا بے حد وجیہہ اور پُر وقار معلوم ہوتا تھا۔ گورے رنگ کی ماڈرن لڑکی اپنے سنہرے گیسوؤں کو جھٹکاتی ہوئی بے حد خوبصورت معلوم ہوتی تھی ——— اور ہم دونوں بڈھے ہو چکے تھے۔ اس لئے کا چرد سے نہ رہا گیا۔ اس نے تلخ آمیز لہجے میں کہا

"سالی ماڈرن چھوکری!"

بیئر پیو۔ بیئر۔ یہی آخری سہارا ہے" میں نے نرمی سے کہا اور

گلاس اٹھا کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔
کاچرو نے ایک ہی سانس میں گلاس کو آدھا کر دیا۔ گلاس کو میز پر رکھ کر اس نے ایک سگریٹ سلگایا۔
کاچرو ایک جہاندیدہ سندھی تھا اور سنڈے ٹائمز کا نائب مدیر تھا میں ریکس ہوٹل کے بینڈ میں کلارنٹ بجاتا تھا۔ ہم دونوں پرانے دوست تھے ۔
"اِس لڑکی کو دیکھ کر مجھے کیٹ یاد آتی ہے "
"کیٹ ؟" کاچرو نے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔
"ہاں، کیٹ" میں نے آہستہ سے کہا "وہ بھی اسی کی طرح ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ میں بھی تمہاری طرح اُسے ایک سائی سمجھتا تھا!"
"کیا قصہ ہے ؟ جلدی جلدی جڑ ا جلاؤ !" کاچرو نے جھلا کر کہا۔
میں یادوں میں کھو گیا۔ آہستہ آہستہ بولنے لگا۔
" اِسی طرح کی خوبصورت شام تھی، یہی نائٹ ہوٹل تھا۔ فضا میں اِسی طرح نشہ لپا ہوا تھا۔ میں زندگی سے بیزار اکتایا ہوا اسی طرح بیئر پی رہا تھا۔ اور آسمان پر ان رنگین شفق آمیز گلگوں بادلوں کو دیکھ رہا تھا جو خوبصورت یادوں کی طرح ذہن کے دریچے میں جھلملاتے ہیں،"
"یہ بکواس بند کرو!" کاچرو بولا۔ منظر نگاری ختم کرو۔ سیدھے سیدھے بتاؤ وہ کون تھی " ؟
"تمہیں کیسے معلوم ہوا ؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
اور پھر پریشان ہو کر اپنی گنجی چاند پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ !

کاچرو نے مسکرا کر پوچھا "وہ بہت خوبصورت ہو گی؟"

میں نے کہا۔ "میں نے ساحل کی ریت میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں بیئر کا گلاس رکھ دیا تھا۔ تاکہ بیئر ٹھنڈی رہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ایک گھونٹ میں پی لیتا تھا۔ میں نے غسل کا لباس پہن رکھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کتنے منٹ میں اس گلاس کو ختم کر کے سمندر میں تیرنے کے لئے جاؤں گا کہ اتنے میں ساحل کی لہروں میں ہلچل پیدا ہوئی۔ اور سمندر کی لہروں سے ایک لڑکی نکلی۔"

"زہرہ کی طرح سمندر کے کف سے؟" کاچرو نے طنزاً پوچھا۔

"بالکل!" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس کے بھورے گیسو شانوں پر لٹیں بن کر آ گئے تھے۔ اس کے بھیگے ہوئے جسم پر کہیں کہیں سمندر کا سفید جھاگ چمک رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ اور وہ کسی نئے ماڈل کی گاڑی کی طرح خوبصورت چھریری اور نازک اندام تھی۔"

"ہاں! پانی میں ڈھل کر گاڑی اور چمک جاتی ہے!" کاچرو بولا۔

میں نے اس حسینہ سے کہا "ہلو خوبصورت جسم!"

وہ بولی۔ "ہلو گنجے!"

تیرنے سے اس کا سینہ سرخ ہو رہا تھا اور چھاتیاں دھڑک رہی تھیں۔ میں نے تالی بجا کر نالش ہوٹل کے بیرے کو بلایا۔ اور اسے ایک بیئر کا آرڈر دیا۔ پھر میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"کیا تم دینس ہو؟"

"نہیں!" وہ ہنسی۔ اور اپنے بھیگے ہوئے سنہرے بالوں کو

نچوڑنے لگی۔

"میرا نام کیٹ ہے، تمہارا کیا ہے؟"

"مجھے کلیان داس کہتے ہیں"

"کس کا کلیان کرتے ہو؟" اُس نے مسکرا کر پوچھا۔

"کلیان تو اپنا کرتا ہوں۔ داس تمہارا ہوں"

وہ زور سے ہنسی۔ اس کی ہنسی میں بڑی بے تکلفی تھی۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔"

"سور!" کاچرو نے پہلی بار مجھے تعریفی نگاہوں سے دیکھ کر کہا "وہ بڑا سستا زمانہ تھا" میں نے اس کی بات اَن سُنی کر کے کہا۔ "بیئر کا ایک گلاس چھ آنے میں ملتا تھا۔ پٹرول کا ایک گیلن گیارہ آنے میں آتا تھا۔

ہم دونوں نے اپنے معدے کی ٹنکی کو بیئر سے بھر لیا۔ اور موٹر کی ٹنکی کو پٹرول سے۔ اور ہم دونوں بمبئی میں اڑتے اڑتے پھرے۔ بہت خوبصورت دن تھا وہ۔ ان دنوں میرے پاس رانٹلے کی ٹوسیٹر سپورٹس کار تھی۔ ڈوسیٹر ـــــ ہم دونوں راستے بھر ساتھ لگ کے بیٹھے اور گندے لطیفے بیان کرتے رہے۔ اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ہنستے رہے۔ کبھی کبھی ایک کھلی بیباک ہنسی سے بیباک چیز اور کوئی نہیں ہوتی۔"

"میں جانتا ہوں!" کاچرو آہستہ سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں کسی خوبصورت یاد کی ایک چمک پیدا ہوئی۔ دوسرے لمحے میں معدوم ہو گئی ـــــ "پھر تم اُسے کس ہوٹل میں لے گئے؟" اس نے لہجہ بدل

کے کاروباری انداز میں پوچھا۔

"وہ بعد کی بات ہے۔ تم سنو تو" میں نے ذرا چڑ کر کہا۔ "اس سے پہلے تو وہ مقام آتا ہے۔ جب مرد عورت کی کمر میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے نا!۔ ایسے موقعے پر ہماری ہندوستانی لڑکی کی طرح ایک شعلے کی طرح بھڑک جایا کرتی ہے۔ لیکن جب میں نے کیٹ کی کمر میں ہاتھ ڈالا تو اسے کچھ محسوس نہ ہوا۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی ہاں، مجھے کچھ محسوس ہوا جیسے میرا ہاتھ کسی عورت کی کمر کے گرد نہ ہو برف کی ایک سِل کے گرد ہو۔!"

"ٹھیک ہے ان ماڈرن لڑکیوں میں کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔"

"پھر جب میں نے اس کے ہونٹوں کو چوما۔ تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں ہونٹ نہیں چوم رہا ہوں: آئس کریم کھا رہا ہوں۔ اور تم جانتے ہو۔ ہونٹ چومنے میں اور آئس کریم کھانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں" کاجرو نے کہا۔ "جب ہونٹ بار بار غیر مردوں سے چومے جائیں تو ان میں عورت کا سارا رس نکل جاتا ہے۔ صرف آئسکریم باقی رہ جاتی ہے۔"

"مجھے حیرت تو ضرور ہوئی، مگر کچھ اُلجھن سی بھی ہوئی۔ کیسی لڑکی ہے۔ اسے کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے یہ بے حد اوباش اور آوارہ لڑکی ہے۔ اس لئے میں اسے بلا تکلیف ایک ہوٹل میں لے گیا کمرے کے اندر جاکر وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور اپنی سینڈل کی ایڑیوں سے فرش کو بجانے لگی۔ یکایک رُک کر بولی "اب؟"

یہ سُن کر میں اُس کی طرف باہیں پھیلا کے بڑھا"

یکایک وہ زور سے ہنسنے لگی ۔
میں رُک گیا ۔ میری بانہیں نیچے آگریں ۔ میرا خیال ہے میں اس وقت انتہائی احمق معلوم ہو رہا تھا ۔
" یقیناً " کا جرو نے لقمہ دیا ۔
" یہ کیا حرکت ہے ؟ " میں نے ذرا غصے سے کیٹ کی طرف دیکھ کر کہا ۔
وہ برابر ہنسے جارہی تھی ، ہنستے ہنستے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے بڑی مشکل سے اُس نے اپنی ہنسی روکی ۔ آخر بولی ۔
" اچھا تماشہ رہا "
" کیا مطلب ؟ "
" مطلب یہ کہ تم بڑے احمق ہو ۔ جب تم نے میری کمر میں ہاتھ ڈالا ۔ اس وقت بھی تم کچھ نہ سمجھے ۔ جب تم نے مجھے چوما ، اس وقت بھی تم کچھ نہ سمجھے ۔ مسٹر ! "
وہ میرے بالکل قریب آگئی ۔ اُس نے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دئے اور میرے شانوں پر اُس کی گرفت بیحد مضبوط ہوتی گئی ۔
اور آہستہ سے بولی ۔ " مسٹر ! تمہیں یہ تک معلوم نہیں کہ عورت کب کسی سے محبت کرتی ہے اور کب وہ آگ بن جاتی ہے کب برف بن جاتی ہے ۔
مسٹر ! کبھی تم نے برف گرتے ہوئے دیکھی ہے ؟ "
میں نے محجوب ہو کر کہا " اب دیکھ رہا ہوں "
" تو اس سے سبق سیکھو ! اور ہمارے شوخ و چنچل انداز سے

ہماری لگاوٹ کی باتوں سے غلط مطلب مت نکالو۔ زندگی بہت لمبی ہے اور ہم کو اس دنیا میں پرانی عورتوں کی طرح منہ لسورے ہوئے گذرنا نہیں چاہیئے اس لئے ہماری خوش وقتی کو محبت مت سمجھو کسی عورت کا جسم اتنا سستا نہیں ہوتا جتنی مرد کی نگاہ سستی ہوتی ہے۔"

"مجھے معاف کردو بھئی!" میں نے جھلا کر کہا "اگر معلوم ہوتا کہ اس خوش وقتی کے ساتھ اتنا لمبا چوڑا لکچر بندھا ہوا ہے تو میں تمہیں کبھی یہاں نہ لاتا!"

یکایک میرے اُداس چہرے کو دیکھ کر اُسے ترس آگیا۔ وہ مسکرادی اس نے اپنے ہاتھ میرے شانوں سے ہٹا لئے۔ اور ایکدم پُرسکون آواز میں بولی۔

"جاؤ تمہیں معاف کیا۔ تم مجھے بُرے آدمی نہیں معلوم ہوتے ہو۔ اور تمہارے ساتھ آج کا وقت بہت اچھا گذرا۔ نہیں تو آج میں رو دیتی"

"تو کیا تمہیں بھی؟" میں نے رُک کر پوچھا "کسی سے محبت ہے؟"

"اور تمہارا کیا خیال ہے؟ میں سمندر کے ساحل پر تمہیں درشن دینے آئی تھی" اس نے آہستہ سے محزون لہجے میں کہا۔ "آج ہم دونوں نے پروگرام بنایا تھا کہ دن بھر جوہو پر تیریں گے۔ اور شام کو پکچر دیکھیں گے!——

مگر وہ کمبخت آیا ہی نہیں"

"کون ؟"

"ڈیوڈ !"

"کون ڈیوڈ ؟"

"میرا ڈیوڈ"

یکایک وہ کرسی پر اُداس ہو کر بیٹھ گئی اور اُس نے کسی معصوم بچّے کی طرح اپنا چہرہ لٹکالیا۔ جس کے ہاتھ سے مٹھائی چھین جاچکی ہو۔

میں نے کہا "پکچر تو میں بھی دکھا سکتا ہوں"

وہ بولی ۔"پکچر تو میں ضرور دیکھوں گی"!

"راؤنڈ لوٹ" کا چرو طنزاً مسکرا کر بولا۔

پکچر میں میں بڑے قاعدے اور سلیقے سے بیٹھا۔ کسی طرح کی بیش دستی میں نے نہیں کی۔ آخر اس نے خود ہی مجھ پر رحم کھا کر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدیا۔ یہ کہہ کر۔

"لو، اسے تم رکھ سکتے ہو" ہاتھ نرم اور گرم بھی تھا۔ لیکن جتنی دیر میں تھیٹر میں بیٹھا رہا۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ میں اپنے ہاتھ میں ایک عورت کا ہاتھ نہیں ایک ہتھوڑا لئے بیٹھا ہوں۔

پکچر کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ اس کا اینگلو انڈین باپ ایک انگریزی فرم میں سٹینو تھا۔ ماں فوج میں دیکالی تھی۔ دونوں مجھے بڑی سرد مہری سے ملے، کیونکہ اس وقت ہمارا ملک آزاد نہیں ہوا تھا۔ اور حالانکہ مجھے دن رات مغربی لوگوں سے واسطہ رہتا ہے۔ اپنا پیشہ ہی

ایسا ہے۔ پھر بھی میری بے تکلف خوش اخلاقی پیران کی سرد مہری سے اور سی پڑ گئی۔ میں وہاں چند منٹ ہی رُکا۔ کیٹ میرے ساتھ باہر پورچ تک مجھے چھوڑنے کے لئے آئی۔ کیٹ کی آنکھوں میں ایک عجیب سا ملال تھا۔ بولی۔

"یہ میرے ماں باپ پُرانے لوگ ہیں۔ یہ نہیں بدلیں گے "

"مجھے معلوم ہے۔ اچھا گڈ بائی " میں اس سے ہاتھ ملا کے جانے لگا

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی " تم مجھے چوم سکتے ہو "

"میں !" میں نے غصے میں کہا اور ہاتھ چھڑا کر جانے لگا۔

وہ بولی۔ " ہمارے ہاں دو طرح کا چومنا ہوتا ہے۔ ایک میں دوستی ہوتی ہے اور رشتے داری۔ دوسری میں محبت ! ، ایک میں نہایت گہرا جذبہ شامل ہوتا ہے۔ دوسرے میں صرف آداب ! تم لوگ ہمارے طور طریقوں سے غلط اندازہ لگاتے ہو۔ اس لئے میں چاہتی ہوں تم مجھے نہایت پاکیزگی سے چومو "

میں نے جلدی سے اس کے رخسار کو اپنے ہونٹوں سے چھُوا اور الگ ہو گیا۔

" اوہ ! اس قدر غصّے سے بھرے بیٹھے ہو " وہ ہنس کر بولی لیکن اس نے میرے ہاتھ کو نہیں چھوڑا " تم ہندوستانی بہت عمدہ رقیب ثابت ہو سکتے ہو۔ "

" مجھے جانے دو اب " میں نے کہا۔

" پھر کب ملو گے ؟ "

" سالی چالباز ! " اب کا چرہ غصے سے بولا۔ " کس طرح ڈور

باندھ کر کھینچ لاتی ہیں یہ لڑکیاں!

"میں بھی اس وقت یہی سمجھا!" میں نے کاچرو سے کہا۔"اس لئے دوبارہ ملنے کے لئے ہاں کہدی۔ اس نے مجھے دوسرے دن گرین میں آنے کو کہا جہاں سوکر لوگوں کے لئے ایک بال ہونے والا تھا۔ اتفاق سے اس روز ٹیکسی میں کمبرے نہیں تھا اس لئے میں نے ہاں کہہ دی۔

چلتے چلتے کیٹ نے کہا "ضرور آنا میں تمہیں ڈیوڈ سے ملاؤں گی۔"

"واہ ڈھیل دیکر پھر کھینچا!" کاچرو نے صحیح کمنٹ کیا۔

ویر ماڈرن لڑکیاں بڑی حرافہ ہوتی ہیں۔ میں ان کو خوب جانتا ہوں!"

جانا تو میں بھی چاہتا تھا اور میں بال میں جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ڈیوڈ کو دیکھنے کا اشتیاق مجھے وہاں کھینچ کرلے ہی گیا۔ اس زمانے میں میں بھی جوان تھا۔ اور میری شکل وصورت بھی بری نہ تھی، اس لئے میں ڈیوڈ کو دیکھنا چاہتا تھا آخر اس میں کون سے لعل لگے ہیں۔؟ پہلے تو میں نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ پڑا پڑا اپنے کمرے میں وسکی پیتا رہا۔ آخر جب نہ رہا گیا اور میں اپنی ٹائی نکال کر گرین کے نیچے پہنچ ہی گیا۔ اس وقت آدھی رات گذر چکی تھی اور بال زوروں پر تھا۔ بہری کا بینڈ ایک تیز والس کی گت بجا رہا تھا۔ کیٹ اس وقت ڈیوڈ کے بانہوں میں ہوگی۔ یہی سوچتے سوچتے میں غصے میں گرین کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اور ہال میں جا پہنچا۔ وہاں ڈیوڈ کہیں نہیں تھا۔ اکیلی کیٹ موجود تھی اور ایک بڈھے پارسی کے ساتھ بڑی بے دلی سے ناچ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اس سے معافی مانگ کے الگ ہوگئی اور میری ٹیبل پر آ بیٹھی۔

"تم نے اتنی دیر لگادی؟" اس نے پوچھا۔

"ڈیوڈ نہیں آیا؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے!" محزوں لہجے میں بولی۔ میں نے اسے ٹیلیفون کیا تھا۔ اور اس نے وعدہ کیا تھا۔ وہ ضرور آجاتا۔ مگر تم جانتے ہو یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ عین موقعے پر اس کی ڈیوٹی لگ گئی ہوگی۔

"ڈیوڈ کیا فوج میں ہے؟"

"ہاں کارپورل ہے"

"کہاں کا رہنے والا ہے؟"

"ہے تو امریکن یہودی۔ نیویارک کا رہنے والا ہے مگر مجھ سے بیحد پیار کرتا ہے۔"

"تو اس وقت تک کیوں نہیں آیا؟"

"آجائے گا۔ جب تک تم میرے ساتھ ناچو!"

ہم لوگ صبح چار بجے تک ناچتے رہے مگر ڈیوڈ نہیں آیا۔ آہستہ آہستہ ہال کی روشنیاں پھیکی پڑ گئیں۔ اندھیرا دور ہوتا گیا۔ ہال کے فرانسیسی دریچوں سے گیٹ وے آف انڈیا کے خوبصورت نقش و نگار ہویدا ہونے لگے۔ سمندر پر پھیلا ہوا کہرا آہستہ آہستہ دور ہوتا گیا۔ پھر یکایک بینڈ خاموش ہو گیا۔ کہیں دور سمندر میں چلتی ہوئی کسی موٹر بوٹ کی چگ چگ سنائی دے رہی تھی۔

یکایک کیٹ ایک کرسی پر گر پڑی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لئے۔ اس کے ہونٹ خشک تھے اور اس کا سینہ زور زور سے چل رہا تھا۔

چگ! چگ! موٹر بوٹ کہیں دور جا رہی تھی "میرا خیال ہے یہ سب فراڈ تھا! دھوکا جو تم سے کیا گیا!" کاچر دنے رائے دیتے ہوئے کہا۔

"دراصل ڈیوڈ کوئی تھا ہی نہیں۔ یہ سارا قصہ تمہیں جال میں پھنسانے کیلئے گھڑا گیا تھا"

میں نے بھی یہی سمجھا۔ اور اس کے بعد جو دو تین ملاقاتیں ہوئیں۔ اس میں کیٹ نے جو فاصلہ رکھا ہے مجھ سے اور جس طرح بار بار وعدہ کر کے مجھے ڈیوڈ کو نہیں ملایا۔ اس سے میرا یقین قوی ہو تا گیا کہ دراصل ڈیوڈ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اور یہ سب مجھے پھنسانے کے لئے اداکاری کی جارہی ہے۔

اس کے بعد جب کیٹ نے مجھ سے ایک روز تین سو روپے مانگے تو اس دن تو مجھے یقین ہو گیا کہ کیٹ بھی ایک سستے ٹائپ کی چھوکری ہے۔

میں نے پوچھا "تمہیں تین سو روپے کیوں چاہیئے؟"

"میں ڈیوڈ سے شادی کر رہی ہوں"

"تو شادی تمہارے ماں باپ کریں گے میں کون ہوتا ہوں تمہیں تین سو روپے دینے والا۔"

"میرے ماں باپ اس شادی کے خلاف ہیں۔ کہتے ہیں ڈیوڈ ایک یہودی ہے"

"یہودی ہے تو کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ہم لوگ رومن کیتھولک ہیں۔ ڈیوڈ یہودی ہے۔ میرے ماں باپ نہیں مانتے۔ کیونکہ ڈیوڈ مجھ سے شادی کر کے مجھے اسرائیل لے جانا چاہتا ہے"

"تم اسرائیل جاؤگی؟"

"ہاں جاؤں گی۔ جہاں ڈیوڈ جائیگا وہاں جاؤں گی!"

"مگر اسرائیل ایک بنجر اور ویران علاقہ ہے" میں نے کہا۔

"وہاں ڈیوڈ تو ہوگا اور جہاں ڈیوڈ ہوگا وہاں بہار آسکتی ہے وہاں بہار کو آنا ہی ہوگا۔ ڈیوڈ کہتا ہے ہم لوگ وہاں بنجر زمینوں میں کاشت کریں گے۔ اپنے ہاتھ سے ہل چلائیں گے۔ ایک نئے ملک کی تعمیر کریں گے۔ ڈیوڈ سے میرے بچے ہوں گے۔ میں انھیں عبرانی زبان میں پُرانی انجیل پڑھاؤں گی۔ جب خدا کا حکم، مشعل بن کر کوہ طور پر لپکا اور پہاڑوں کا جگر کاٹ گیا۔ جانتے ہو؟"

میں نے سر جھکا کر کہا "صرف یہ جانتا ہوں کو تمہارا حکم کیا ہے تمہیں تین سو روپے چاہیئے نا۔ یہ لو۔ ان کا کیا کروگی؟"

"چھبیس اگست کو ڈیوڈ کا جہاز چلا جائے گا۔ اس سے پہلے ہماری شادی ہو جانی چاہیئے۔ میں اس رقم سے اپنی شادی کا جوڑا تیار کرونگی تم میری مدد کو نہ آتے تو میں مرجاتی!"

یکایک اُس نے مجھے چوما اور بھاگ گئی۔

چھبیس اگست کو ڈیوڈ کا جہاز جانے والا تھا اور شادی کی تاریخ پچیس کو طے ہوئی تھی۔ کیٹ نے مجھے خاص طور پر بلایا تھا۔

"چرچ گیٹ اسٹریٹ کے عقب میں جو بڑا گرجا ہے وہاں شادی کی رسم ادا ہوگی۔ پچیس اگست کو بھولنا نہیں!"

"نہیں بھولوں گا"

"ڈیوڈ کی طرف سے دو دوست آئیں گے۔ میری طرف سے صرف تم ہوگے! ضرور آجانا"

"ضرور آؤں گا"

"یقیناً انگشت کو تم گئے ہو گے اس گرجا میں" کا جیرو نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں"

"اور ڈیوڈ حسب دستور نہیں آیا ہوگا۔"

"ہاں! وہ تو نہیں آیا تھا۔" میں نے حیرت سے کا جیرو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"پھر تم نے مسٹر جوزف کلیان داس سے تم نے اس لڑکی کی حالت پر رحم کھا کر اس سے شادی کی درخواست کی ہوگی۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو تم!"

"جو روتے روتے منظور کر لی گئی ہوگی"

"جو نا منظور کر دی گئی"

"ہیں" یکایک کا جیرو حیرت سے بولا۔ پھر اس نے اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا "کم بخت بہت چالاک نکلی۔ بھئی بہت ہوشیار نکلی۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" میں اس کی بات کو بالکل نہ سمجھ سکا۔

"اچھا تم آگے بتاؤ۔ میں بالکل آخر میں بتا دوں گا۔"

میں نے کہا۔ سپید عروسی جوڑے میں کیٹ کسی قدر حسین اور پاکیزہ معلوم ہو رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تقدس تھا اور اس کی چال میں ایک عجیب طمانیت اور ٹھہراؤ۔ اب وہ برق صفت سیماب آسا لڑکی نہ تھی۔ ایک عورت

تھی ۔ایک ماں تھی، ایک گھر تھی ۔ ایک جنت تھی ، ایک کائنات تھی جس کی پہنائیوں میں تخلیق اور تہذیب کے گہوارے . . . . . .

"فلسفہ نہیں چاہیئے کہانی سناؤ۔" سنڈے ٹائمز کا سب ایڈیٹر کاچرو ایکدم کاروباری انداز میں بول اٹھا ۔" جب ڈیوڈ نہیں آیا اور گرجے میں تم نے دیر تک انتظار کیا ۔ اور جب کیٹ رو رو کر نا دلی ہو گئی اور تم نے اس سے شادی کی درخواست کی تو پھر کیا ہوا ؟"

" میری شادی کی درخواست پر اس نے زور سے میرے مُنھ پر طمانچہ مارا اور روتی ہوئی گرجے سے باہر نکل گئی ـــ اور ٹیکسی میں بیٹھ کر یہ جا ۔ وہ جا . . . . . . "

" ارے !" کاچرو ذرا حیرت سے بولا" پھر تمہیں وہ کب ملی؟" اس کے بعد وہ کئی ماہ تک مجھے نہیں ملی ۔ میں اسے ڈھونڈتا رہا ۔ چھبیس اگست کو برنس ڈاک پر گیا تھا جس جہاز سے ڈیوڈ کو جانا تھا ۔ مگر مجھے وہ وہاں بھی نظر نہ آئی ۔ گھر گیا تو وہاں پر بھی نہ ملی ۔ اس کے باپ نے مجھے ایسی قہر بھری نظروں سے دیکھا کہ میں نے وہاں جانا دوبارہ مناسب نہ سمجھا ۔

پھر اس واقعے کے چند ماہ بعد وہ مجھے ریکس ہوٹل کے کیبرے میں مل گئی ، اچانک ۔ ایکدم ۔ وہی شوخ چنچل ادائیں والی کیٹ جیسے اسے کوئی پرانی بات یاد نہیں رہی تھی ۔ بہت جلد ہی ہم دونوں گھُل مل گئے ۔ اور اب وہ میری بیوی ہے ۔"

کاچرو کچھ کہنے والا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو روک لیا ۔ جلدی میں وہ گلاس اٹھا کر خالی کر گیا اور مسکرا کر بولا ۔

"دوست کچھ بھی کہو۔ تمہاری بیوی تم سے شدید محبت کرتی ہے مگر اُس نے یہ انوکھا ڈھنگ تم سے شادی کرنے کا رچایا تھا۔ میں اُس کے تریا چرتر کی داد دیتا ہوں۔"

میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ اگر کبھی میں چڑانے کی خاطر کیٹ سے ڈیوڈ کا ذکر کرتا تو وہ ہنس کر کہتی۔

"وہ تو ایک اداکاری تھی تمہیں پھنسانے کے لئے اور تم اس میں پھنس گئے ورنہ ڈیوڈ کا وجود ہے کہاں؟"

لیکن کبھی کبھی مجھے شبہ بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب میرا بڑا لڑکا پیدا ہوا تو اس نے اس کا نام ڈیوڈ رکھا۔ کیوں؟

"تمہیں چڑانے کے لئے"، کاجرو نے جواب دیا۔

کبھی کبھی رات میں سوتے سوتے بے اختیار اس کے منہ سے نکل جاتا ہے۔ "ڈیوڈ — میرے ڈیوڈ!"

"تمہیں جلانے کے لئے! یہ سب تریا چرتر ہے۔ میں جانتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کبھی میں بس یہی سمجھتا تھا۔ مگر آج یہ خط آیا ہے۔ میری بیوی اس وقت غسل خانے میں تھی۔ میں نے ڈاکئے سے لے لیا لیکن جب میں نے اس پر اسرائیل کا ٹکٹ دیکھا تو میں چونک گیا۔ میں نے جلدی سے اس خط کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔

کاجرو میری طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگا۔

میں نے جیب سے خط نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔

کاجرو دیر تک اس خط کو دیکھتا رہا پھر اُس نے اسے پڑھے بغیر میری طرف سرکا دیا۔ اور بولا۔ "اس میں کیا لکھا ہے؟"

میں نے کہا "اس میں ڈیوڈ کی تصویر ہے۔" ڈیوڈ کا خط ہے
پانچ سو پونڈ کا ایکسچینج ڈرافٹ ہے۔ ڈیوڈ اسے اسرائیل
بُلا رہا ہے۔"

کاچرو حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "غلطی میری تھی۔ میں نے کیٹ کے جذبۂ ترحم کو عشق سمجھا۔ حالانکہ مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ میں اس کے لئے اس کا عاشق کبھی نہ تھا۔ میں تو ایک رومال تھا جس سے کبھی کبھی وہ اپنے آنسو پونچھ لیا کرتی تھی۔ ایک بٹوہ تھا۔ جس سے کبھی کبھی وہ پیسے نکال لیا کرتی تھی ایک اندھیرا کونہ تھا۔ جہاں وہ کبھی کبھی اپنی زندگی کے راز لوگوں کی نظروں سے چھپا کر رکھ دیا کرتی تھی! مجھے اس سے محبت تھی۔ اُسے تو نہ تھی!"

"اب تم کیا کرو گے؟" کاچرو کی نظریں اپنے گلاس پر جم گئیں۔

میں نے اپنے سینے سے اُبھرتی ہوئی آہ کو بڑی سختی سے دبا کر کاچرو سے کہا۔

"میں اسے اس کا خط دے دوں گا اور بنجر زمینوں میں بہار آجائے گی اور جو جس کا ہے وہ اس کا ہو جائے گا۔ اور خوابوں میں ماں نے جس کے بچوں کا منھ چوما تھا۔ وہی بچے سینوں کے جزیروں سے سرکتے ہوئے اس کے پاس آجائیں گے اور زیتون کی چھدری چھاؤں میں یا جھکے ہوئے انجیروں کے خنک سایوں میں پرانی عبرانی زبان میں قدیم انجیل پڑھیں گے "جب خدا کا حکم شعلہ بن کر کوہ طور پر لپکا اور پہاڑوں کا جگر کاٹ گیا!" ......

میں نے خط اُٹھا کر لرزتی ہوئی انگلیوں سے اپنی جیب میں

لیا اور باہر ساحل کی طرف دیکھنے لگا۔ تاکہ کنا چرو میرے آنسو نہ دیکھ سکے۔

ساحل پر سنہرے بالوں والی لڑکی نے اپنا سر اپنے محبوب کے کندھوں پر رکھ دیا تھا اور اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

خوابوں کے جزیرے!

...

پرتو

جب وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈبے کے اندر آیا تو اس کے چلنے کے انداز سے میں نے محسوس کیا کہ وہ فوج میں ملازم رہ چکا ہے۔ اس کی شخصیت بڑی پُر وقار تھی۔ قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا۔ رنگ سُرخ و سپید، براق نورانی داڑھی۔ اس نے کالی مرچ کے رنگ کا اوُنی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور سر پر مونگیا رنگ کی پگڑی کس کر باندھ رکھی تھی اور ڈبے کے درمیان روشنی میں اس کی پگڑی کی تہوں میں سے ابرق کے ٹکڑے جواہر ریزوں کی طرح چمک اٹھتے تھے۔ وہ سیدھا چلتا ہوا متوازن قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آکر رُکا۔ جُھک کر اس نے قریب کی سیٹ کا جائزہ لیا اور اطمینان کی سانس لے کر سیٹ پر دراز ہو گیا۔ سیٹ اس کے وزن

سے پیچھے کو ہوگئی۔ اس نے دیکھا اور بولا "نہٹنے والی کلدار نشستیں بہت عمدہ ہیں!"

میں نے اپنا جلتا ہوا سگریٹ جسے میں نے ابھی ابھی سلگایا تھا۔ جلدی سے خاکدان میں بجھا دیا۔ بوڑھا سکھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور اس نے کہا۔

"شکریہ! مجھے تمباکو کا دھواں واقعی بہت بُرا معلوم ہوتا ہے!"

مجھے اس کے دانت، جب وہ مسکرایا تو بہت اچھے معلوم ہوئے۔ سپید اور مضبوط دانت، جُڑے جُڑے اور ہم سطح۔ اس بوڑھے فوجی سکھ کی عمر ستّر برس سے کم نہ ہوگی لیکن اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اب بھی جوانی کی چمک اور اس کا تجسّس پایا جاتا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ غیر معمولی طور پر صحت مند دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جوانی میں تو وہ بے حد حسین اور دلآویز شخصیت کا مالک رہا ہوگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر مجھے جو چیز کھل رہی تھی وہ متعدد زخموں کے نشان تھے۔ دائیں بائیں اس کے رخساروں پر تین چار لانبے لانبے زخموں کے نشان رہ گئے تھے۔ دائیں رخسار پر تو زخموں نے ایک صلیب سی بنا ڈالی تھی اور بائیں رخسار پر یہ زخم انگریزی V وی کا نشان بناتے تھے۔ اور جب اس نے اپنی ٹائی ٹھیک کرنے کے لئے ہاتھ اوپر کئے تو میں نے دیکھا کہ اس کی ہتھیلیوں کی پشت پر بھی زخموں کے ایسے چھوٹے چھوٹے بیسیوں نشان ہیں جیسے کسی نے تیز دھار کے چاقو سے ان ہاتھوں کا قیمہ بنانے کی کوشش کی ہو۔

جنگ ! میں نے اپنے دل میں سوچا۔ جانے پہلی جنگ عظیم کے کس محاذ پر اسے یہ حادثہ پیش آیا ہوگا۔ وہ تو خیریت رہی کہ اِس خوبصورت اور وجیہ اِنسان کی ہاتھ یا ٹانگ نہیں کٹی۔ ورنہ کتنا برا معلوم ہوتا یہ آدمی !

مجھے اس معاملہ پر زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ ریستوران کار کے بیرے نے آکر کہا کہ اب آپ لوگ آ کے کھانا کھالیں۔ ہم لوگ دس بجے ریستوران بند کر دیتے ہیں۔

میں اٹھ کھڑا ہوا وہ بوڑھا سکھ بھی میرے ساتھ اٹھ گیا۔

"حالانکہ میں آٹھ بجے گھر سے کھانا کھا کے چلا تھا مگر اس وقت بھوک محسوس کر رہا ہوں۔" بوڑھا سکھ ہنس کر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"اور میں اِس لئے دیر میں کھانا کھا رہا ہوں کہ مجھے بھوک نہ تھی۔" میں نے جواب دیا۔

ہم لوگ ڈائننگ کار میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں بیروں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ صرف ایک کونے کی میز پر ایک نوجوان جوڑا کافی پی رہا تھا۔ اور کھڑکی سے باہر رک رک کر پورن ماشی کے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کا ہاتھ مرد کے ہاتھ میں تھا۔ جسے وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد دبا دیتا تھا۔ ہاتھ کے دباتے ہی لڑکی کے چہرے پر ایک گلنار مسکراہٹ کھل اٹھتی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے لڑکے کے ہاتھ میں کوئی سوئچ (SWITCH) ہے کہ جسے بار بار دبانے سے یہ مسکراہٹ بجلی کے قمقموں کی طرح روشن ہو اٹھتی ہو۔ لڑکی کے بال خوشنما طریق سے کٹے ہوئے تھے اور وہ بڑی دل رُبا صورت والی، موہنی اداؤں والی لڑکی تھی اور شکل و صورت سے ایک ایسی ہندوستانی کرسچین معلوم ہوتی تھی

جس میں یورپی خون کا بھی دخل رہا ہو۔ لڑکا خالص ہندوستانی تھا۔ سانولے رنگ کا مر اٹھا، جسم ناٹا لیکن مضبوط اور گٹھا ہوا گھنے چمکیلے بال اور چوڑے چوڑے جبڑوں پر گھٹے ہوئے شیو کی نیلاہٹ تھی اس کے سر کی حجامت بھی بالکل تازہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی بال کٹوا کر آیا ہے۔ اُس کے کپڑے بیحد صاف ستھرے تھے۔ اور اس کے روئیں روئیں سے زندگی کی صحت مند آرزوئیں پھوٹ رہی تھیں۔

لڑکی کا ہاتھ اُس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور بار بار وہ اُسے اس طرح دباتا تھا۔ جس طرح گویا وہ اس میں برقی رَو بھرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اس لڑکی کی نیلی ساڑھی کا پلّو برابر مسکے جا رہا تھا۔ اور اس کی بے حد سیاہ چھوٹی اور چمکیلی آنکھیں لڑکی کو اس طرح دیکھتی تھیں۔ جیسے وہ لڑکی، لڑکی نہ ہو۔ مٹن کی ایک پلیٹ ہو۔

"محبت میں صحت کو کس قدر دخل ہے ؟" میں نے اپنے زرد رخساروں کو آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

جواب میں بوڑھے سکھ نے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ اب کھانا ہم دونوں کے سامنے تھا اور وہ مکمل انہاک سے کھانے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ ہمارے کھانے کے دوران میں ہی وہ جوڑا کافی پی کر اور بل ادا کر کے چلا گیا۔

چلتے چلتے وہ گلنار مسکراہٹ پھر لڑکی کے لبوں تک آئی اور مجھے اس لڑکی کی وہ گلنار مسکراہٹ، اُس کے تبسم کی ادا بے حد پسند آئی جب وہ لڑکے کی طرف دیکھتی تھی۔ کتنی چاہت اور سپردگی تھی اُس کی

نگاہیں ! ــــ کبھی کبھی تو عورت ایک نگاہ میں سب کچھ دے ڈالتی ہے۔ اور پھر ایک خالی برتن کی طرح معصوم کھڑی کی کھڑی دیکھتی رہ جاتی ہے ! ـــ بس اسی وقت وہ سب سے پیاری بھی معلوم ہوتی ہے مسکرانے کے بعد کچھ اس طرح کی نگاہ سے اُس لڑکی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تھا اور پھر جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اور نوجوان اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے ویٹ بیول میں لے گیا تھا۔ اور اُن کے جاتے کے بعد ریستوران کار اور بھی سونی سونی سی دکھائی دینے لگی۔ اور کھڑکی میں لٹکا ہوا چاند مجھے ایسا محسوس ہوا گویا صرف انھیں کے لئے لٹکا دیا گیا تھا ـــــــ میں نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی پر پردہ ڈال دیا۔

بوڑھا سکھ میری حرکت پہ مسکرایا، مگر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا کھانا کھانے کے بعد بوڑھے سکھ نے کافی منگائی اور میں سگرٹ پینے کے لئے باہر ویٹ بیول میں آگیا۔ ویٹ بیول کے ایک کونے میں وہ نوجوان اُس لڑکی کو چوم رہا تھا اور چاند لڑکی کے چہرے پر تھا۔

اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا "یہ آنسو کیسے ؟"

"یوں ہی ! یوں ہی !" لڑکی اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولی۔ اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور اُس کے چہرے پر پھر وہ دلآویز تبسّم آیا۔ من موہنا، محبت میں ڈوبا ہوا گلنار تبسم !

لڑکے نے پھر اسے ایک بار چوما۔

لڑکی کے شانے کانپے۔ اُس نے ٹھٹھر کے کہا۔

"چلو ڈارلنگ اندر چلیں۔ یہاں سردی ہے۔ اور۔۔۔۔"
اس نے خاموشی سے اپنی نگاہوں سے میری طرف اشارہ کیا، میں جو دوسری کھڑکی میں کھڑا بظاہر باہر پورنیما کے چاند کو دیکھ رہا تھا لڑکے نے میری طرف اس طرح دیکھا گویا مجھے ابھی چھرا بھونک دے گا۔ پھر اُس نے آہستہ سے گھوم کر لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اُسے ویسٹی بیول سے نکال کر اندر ڈبے میں لے گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بوڑھا سکھ بھی کافی پی کر ریستوران کار سے نکلا میں نے بھی اتنے میں اپنا سگرٹ ختم کر لیا تھا۔ ہم دونوں واپس اپنے ڈبے میں آکر اپنی سیٹوں پر دراز ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد گارڈ ڈبے میں آیا۔ اس نے سب بتیاں بجھا دیں لیکن ڈبے کے باہر چاندنی مکمل طور پر کھل اٹھی تھی اور اس کی سپید مدھم روشنی میں گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے خاموش اور سہمے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

میں نے کہا "مجھے اس چاندنی میں نیند نہیں آتی۔ کھڑکی کا پردہ سرکا دوں؟"

"ذرا ٹھہرو" بوڑھے سکھ نے بہت ہی دھیمے لہجے میں بے حد پرسوز آواز میں کہا۔

"یہ پونم کی رات بہت بھیانک ہے۔ بہت خوبصورت بھی ہے مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ مگر میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کچھ دیر اور اس چاند کو دیکھ لوں!"

"چاند کو تو نوجوان لوگ دیکھتے ہیں، ہمارے دیکھنے کی یہ چیز نہیں"

میں نے افسردہ تبسم کے ساتھ کہا۔

بوڑھا سکھ مسکرایا۔ اس کا دایاں رخسار چاندنی میں تھا۔ اور صلیب کا نشان بہت گہرا دکھائی دے رہا تھا۔ بائیں رخسار کی تو تاریکی میں گم تھی ۔

میں نے کہا " تمہارے رخساروں کے یہ زخم ۔ کیا تم نے جنگ میں حاصل کئے ہیں۔ جنگ ؟ "

بوڑھے سردار نے میری طرف دیکھ کر اپنے آپ میں گم ہوتے ہوئے کہا۔

" ہاں ! جنگ ہی تو تھی " وہ رک کر آہستہ سے بولا۔

" کون سی جنگ ؟ " پہلی جنگِ عظیم یا اُس سے پہلے کی کوئی جنگ؟ "
میں نے پوچھا ۔

" میں تو کبھی فوج میں نہیں رہا " بوڑھے سکھ نے آہستہ سے کہا ۔

میرا قیاس بے بنیاد ثابت ہوا۔ اِس لئے میری دلچسپی بڑھ گئی
میں نے پوچھا۔

" پھر یہ زخم کیسے ؟ "

بوڑھے سکھ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ چاند اپنی جگہ تھا۔ کھڑکی اپنی جگہ تھی ۔ مسافر ڈبے میں خال خال ہی تھے ۔ ہمارے آگے پانچ چھ سیٹیں چھوڑ کر ڈبے کے آخر میں تاریک کونے میں وہ لڑکا اور لڑکی اپنی اپنی کرسیوں پر دبکے ہوئے تھے ۔ لڑکی کا سر لڑکے کے شانے پر تھا۔ اور لڑکے کا بازو لڑکی کے شانے پر تھا ۔ آنکھیں دونوں کی بند تھیں۔

بوڑھے سکھ نے مجھ سے پوچھا "یہ قصہ خود سنو گے؟"

"اگر تمہیں نیند نہ آرہی ہو تو سنا دو۔"

"نیند تو مجھے اس چاندنی میں کبھی نہ آئے گی!" بوڑھے سردار نے بڑے گداز لہجے میں کہا۔ پھر اس نے اس طرح مجھ سے کہا جیسے وہ قصہ سنانے کے لئے تیار ہو چکا ہو۔

اس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا ـــ "اچھا تو سن لو۔ تم میرے لئے مکمل اجنبی ہو اس لئے تمہیں سنا دینے میں کوئی حرج نہیں ـــ"

گاڑی کی کھڑکیوں میں دوہرے شیشے لگے ہوئے تھے، جن کی وجہ سے گاڑی کی چھک چھک بڑے میٹھے مدھم غنودگی سے لبریز لہجے میں اندر آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اور گاڑی کے دور رویہ پھیلی ہوئی سفید چاندنی میں سیاہ درخت اپنی شاخوں کو سمیٹے ہوئے، سر جھکائے ہوئے گناہ گار مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔

سردار نے کونے میں سوئے ہوئے مرا بٹے نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جوانی میں میں بھی اسی طرح تھا۔ بے فکر اور لاپرواہ اور خود سر۔ میرا باپ گمندر سنگھ موضع حاصلاں کا نمبردار تھا، اور اس کے علاوہ چک نمبر ۴۲ بھی پورے کا پورا ہماری ملکیت میں تھا، گھر میں کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی۔ گو باپ نے مجھے بی۔اے پاس کرایا تھا۔ لیکن مجھے شروع ہی سے کھیتوں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ قلم کی بجائے میرے ہاتھ درانتی چلانے میں مشاق تھے۔ جانے میں نے بی۔اے کیسے پاس کر لیا۔ میرے باپ کی آرزو تھی کہ میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔ کرنیل بنوں،

مگر مجھے کھیتوں کی زندگی ہی پسند تھی ۔ بھوری بھوری مٹی کی سوندھی مہک، شبنم میں ڈوبے ہوئے ہرے ہرے چنوں کا بوٹ، دُور دھراں کے ٹیلے پر پانی بھرتی ہوئی بانکی ناریوں کی قطار، اور میری سنہری گھوڑی کی دُلکی چال، کچے راستوں پر ہلکی ہلکی دھول جگاتی ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ ! "

میں نے کہا "تم اپنے شباب میں بیحد حسین رہے ہو گے، عورتیں تم پر بہت مرتی ہوں گی "

بوڑھے سکھ نے ایک حزیں مسکراہٹ سے کہا " ایسا تو مجھے کچھ یاد نہیں کہ کسی لڑکی نے مجھ سے محبّت کی ہو ۔ ہاں میں نے ضرور ایک لڑکی سے محبت کی تھی "

" کون تھی وہ ؟ "

" میری بیوی تھی ! "

" بیوی ؟ " ———— میں نے بیحد نا امید ہو کر کہا " کمبخت نے سارے رومانس کا مزا کرکرا کر دیا تھا "

" ہاں ! " جب میں بی ۔ اے پاس کر کے گاؤں واپس آیا تو میرے باپ نے چک جمراں کے نمبر دار کی لڑکی پریتو سے میرا بیاہ کر دیا ۔ پریتو بڑی خوبصورت لڑکی تھی ۔ لانبی اور بانکی گوری اور سنہری ۔ لچکیلی اور نرم جیسے گوار گندل ۔ مگر میں تو اس کی آنکھوں پر مرتا تھا "

" کیوں، ان آنکھوں میں کیا خاص بات تھی ؟ " میں نے پوچھا ۔

" بظاہر تو کوئی خاص بات نہ تھی ۔ بڑی بڑی تھیں اور کالی سیاہ مگر ایسی تو بہت سی عورتوں کی آنکھیں ہوتی ہیں "

" پھر کیا بات تھی ؟ "

"کہہ نہیں سکتا۔ اُن آنکھوں کا رنگ ـــ نہیں نہیں، رنگ نہیں اُن آنکھوں کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔"

"وہ آنکھیں بولتی تھیں۔؟"

"بولتی تو نہیں تھیں لیکن بولنا چاہتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہیں گی۔ مگر وہ مجھ سے کچھ نہ کہتیں ہر وقت سپنے سے دیکھتی رہتیں۔ کبھی ایسی آنکھیں تم نے دیکھی ہیں جو ہمیشہ سپنا سا دیکھا کریں؟"

"جوانی میں سبھی آنکھیں سپنے دیکھتی ہیں" میں نے کہا۔

"ہاں! لیکن سپنے ہر ایک کے الگ الگ ہوتے ہیں۔" بڈھے نے آہستہ سے کہا۔

"میں تو اپنی پریتو پر مرمٹا تھا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ اس لئے ہوا کہ میری زندگی میں اُس سے پہلے کوئی عورت نہ آئی تھی۔ نہ اُس سے پہلے نہ اُس کے بعد۔ پر پریتو تم نے کہیں نہیں دیکھی۔ ورنہ یوں نہ کہتے، وہ تو ایسی عورت تھی۔ جس سے اس کے بیوی ہونے کے بعد بھی اُس سے عشق کیا جا سکتا تھا۔ اور پھر یوں ہی ہوا۔ جب میں گاؤں پہنچا اور میں نے فوج میں بھرتی ہونے سے کسان بننے کو ترجیح دی تو میرے باپ نے فوراً میرا بیاہ کر دیا اور مجھے کھیتوں پر کام کرنے کو لگا دیا۔ حالانکہ اُسے اس بات سے بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔ مگر میں تو بہت خوش تھا۔ تم جانتے ہو اگر میں فوج میں ہوتا تو کیسے اپنی پریتو سے محبت کر سکتا تھا۔ اب تک تو فرنگیوں کی کسی نہ کسی لڑائی میں۔ اٹلی میں یا فرانس میں یا میسوپوٹیمیا میں یا درۂ خیبر میں۔ کہیں نہ کہیں ان لوگوں نے میری جان لے لی ہوتی۔ حالانکہ

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ ہوا وہ اچّھا ہوا یا بُرا ہوا۔"
یکایک وہ چپ ہو گیا۔
میں بھی چپ رہا۔

بہت دیر کے بعد وہ بولا۔ "قصّہ مختصر یہ کہ میں اپنی پریتو کو بہت چاہتا تھا اور وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی۔ اور ہم کبھی ایک دن کے لئے بھی ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوتے تھے۔ لیکن ہماری شادی کے چھ ماہ بعد کیا ہوا کہ میرا سسر اپنے گاؤں میں سخت بیمار پڑا اور پریتو کو اپنے میکے جانا پڑا۔ اس کا باپ بیمار تھا اس لئے میں بھی اسے کیسے روک سکتا تھا چنانچہ پریتو چلی گئی، لیکن اس کے جانے کے بعد میرا دل اپنے گھر میں، کھیتوں میں، اپنی گھڑسواری میں، کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ تین دن تو میں نے جیسے تیسے کر کے کاٹے، لیکن چوتھے دن میں نے اپنی گھوڑی پر زین کسی اور سرپٹ ہو لیا۔ اپنی سسرال کے گھر۔

چک جھُمران ہمارے گاؤں سے تیس کوس پر واقع ہے لیکن میری گھوڑی بڑی تیز رفتار تھی میں شام ہوتے ہوتے چک جھمران پہنچ گیا۔ وہاں جا کے معلوم ہوا کہ میرے سسر کی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ بلکہ ساس اور سسر مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ داماد اپنے سسر کی صحت پوچھنے چلا آیا ہے تو وہ میری سعادت مندی پر بے حد خوش ہوئے۔ دن بھر تیس کوس کا سفر کرنے سے میں بہت تھک گیا تھا۔ اس لئے جلدی کھانا کھا کے میں سو گیا۔

مجھے معلوم تھا اب جو سوؤں گا تو پھر صبح ہی اٹھوں گا۔ میں نے پریتو سے کہا۔ "مجھے صبح ضرور اٹھا دینا۔ میں گھوڑی پر سوار ہو کر صبح سویرے کو جاؤنگا

کہیں ایسا نہ ہو کہ دن چڑھے تک سوتا رہوں۔

لیکن ہوا یہ کہ اُس رات تیسرے پہر ہی میں میری آنکھ کھل گئی۔ اور میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ میری بیوی میرے بستر پر نہیں ہے : دور کمرے کے آخری سرے پر دروازے کے ہلکے سے کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ اور ایک سایہ سا دروازے کے باہر گذرتا ہوا معلوم ہوا میں آنکھیں مَل کر اُٹھ بیٹھا۔ واہگورو، یہ کیا ماجرا ہے ـــــ ؟"

سوچ سوچ کر میں آہستہ سے اپنے بستر سے اُٹھا۔ کرپان کو تکیے کے نیچے سے نکال کر پہنا۔ اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر ہو لیا۔

باہر ایسی ہی چاندنی رات تھی۔ بڑی خوبصورت خوشبوؤں والی چاندنی رات تھی۔ سرس اور شیشم کی شاخوں میں چھپے ہوئے گھونسلوں میں کبھی کبھی چڑیاں غنودگی میں چوں چوں کرتیں۔ مگر ان کے چڑے فوراً اپنی مضبوط چونچ سے ٹھونگ مار کر اُنھیں اپنی گود میں دبا لیتے۔

میرے پاؤں شبنم میں بھیگ چکے تھے، اور میرے چاروں طرف سرسوں کی ہری کونپلیں لہرا رہی تھیں۔ اور کھیتوں میں گذرتا ہوا اپنی پریتو کے تعاقب میں جا رہا تھا۔

پہلے میں نے سوچا۔ وہ کھیتوں میں ضروری حوائج سے فارغ ہونے جا رہی ہے لیکن جب اس نے ایک کھیت کو پار کر لیا، دوسرے کھیت کو پار کر لیا اور تیسرے کھیت کی ڈھلوان سے گھوم کر نیچے کے خشک نالے کو پار کر کے ٹیلوں کے پیچھے غائب ہو گئی۔ تو مجھے کچھ عجیب طرح کی تشویش، حیرت اور کوفت سی ہونے لگی۔ دل کو دھچکا سا لگا اور اب میں ہولے ہولے بہت ہی احتیاط سے اُس کے تعاقب میں چلنے لگا۔

تاکہ اُسے پتہ نہ چلے کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔
تیسرے کھیت کی ڈھلوان سے اُتر کر میں نے نالے کو پار کیا پھر احتیاط سے ٹیلوں کے پیچھے سے گھوم کر میں نے آگے کو نظر دوڑائی۔ سامنے پھر سرسوں کے کھیت تھے۔ کھیتوں کے بیچ میں ایک کنواں تھا۔ کنویں کے قریب بیریوں کا ایک سائے دار جھاڑ تھا۔ جھاڑ کے نزدیک ایک پلنگ بچھا تھا۔ پلنگ کے قریب ایک ناپختہ گھر تھا جس کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔

اور میری بیوی اُس پلنگ پر ایک جاٹ کے ساتھ سو رہی تھی۔ میری پریتو— میری بیوی اُس سے بہت پیار کر رہی تھی۔ وہ بار بار اُس کی آنکھیں چومتی اور اس کے رُخسار۔ اور کتنی شدت تھی اُس پیار میں۔

میری آنکھوں میں خون اُترنے لگا۔ مگر میں چپکا بیریوں کے جھاڑ کے پیچھے کھڑا ان لوگوں کو پیار کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہاں ہاں! اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔

کچھ عرصے کے بعد جاٹ نے میری بیوی سے کہا۔ پریتو! مجھے پیاس لگی ہے۔ اندر سے پانی لا دے۔

پریتو نے اپنا سر اس کے سینے سے ہٹالیا اور بولی۔

" بچنے! تیری پیاس کیا ابھی تک نہیں بجھی؟ "

بچنا جواب میں صرف مسکرا دیا۔ اس نے میری بیوی کے ہونٹ چوم لئے۔ پریتو آہستہ سے پلنگ سے اٹھی اور ادھ کھلے دروازے سے ناپختہ مکان کے اندر گئی۔ بچنا اوندھے منہ لیٹ کر بڑے اشتیاق سے

دروازے کی طرف دیکھنے لگا کیونکہ میری بیوی بالکل ننگی تھی ۔

یکایک میں نے کرپان نکالی اور اُسے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر سر کے اوپر اٹھایا اور پھر اپنی پوری طاقت سے ججینے پر وار کیا۔ ججینے کے منہ سے "ھک" کی ایک ہلکی سی آواز نکلی ۔ دوسرے لمحے میں اس کا سر قلم ہو گیا ۔ پھر میں بیریوں کے جھاڑ کے پیچھے سے کھیتوں میں غائب ہو گیا۔ ٹیلوں کے پیچھے سے نالے کو عبور کر کے سرسوں کے کھیتوں سے گذرتے ہوئے میں نے چند لمحوں کے لئے رک کر اپنی کرپان کو مٹی سے اچھی طرح صاف کیا۔ اور جب وہ بالکل صاف شفاف ہو کر آئینے کی طرح چمکنے لگی تو اُسے میان میں رکھ کر گھر کے اندر آ گیا۔ اور کمرے کے اندر آ کر پھر اپنے بستر پر سو گیا ۔

کوئی آدھے پون گھنٹے کے بعد پرتیو میرے کمرے میں دھیرے سے داخل ہوئی ۔ میں جاگ رہا تھا ۔ لیکن میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور لمبے لمبے سانس لینے لگا ۔ پرتیو نے دروازہ کھول کر پہلے تو مجھے غور سے دیکھا ۔ پھر اس نے آہستہ سے میرے تکیے کے نیچے سے کرپان نکالی اور اُسے کھول کر دیکھا ۔ اور جب اُسے بالکل صاف شفاف پایا تو گویا اس کے دل کا شبہ دور ہو گیا۔ اور وہ میری بغل میں آ کر لیٹ گئی ۔ چپ چاپ پتھر کی سل ۔

بوڑھا سکھ چپ ہو گیا ۔

"کچھ نہیں ہوا؟ اس کا باپ چونکہ صحت یاب ہو چکا تھا۔ اس لئے میں

پرتیو کو لے کر دوسرے دن ہی اپنے گاؤں چلا آیا۔ اور ہم دونوں ہنسی خوشی اکٹھے رہنے لگے۔

دن بیتے، مہینے بیتے، سال بیتے، میں نے کبھی اُس بات کا اس سے تذکرہ نہیں کیا۔ نہ پرتیو نے کبھی کسی بات سے مجھ پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ اُسے کسی بات کا شبہ ہوا تھا۔ یا اُسے کسی بات کا غم تھا۔۔۔ ہاں میں نے ایک بات ضرور دیکھی۔ اس واقعے کے بعد وہ پھر کبھی اپنے میکے نہیں گئی۔ میرے کہنے پر یا اپنے ماں باپ کے اصرار پر بھی نہیں گئی۔ ہوتے ہوتے میں بھی اس واقعے کو بھول سا گیا۔ کیونکہ اب ہمارے بچے ہو گئے تھے۔ میرے اور پرتیو کے بچے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی بڑے خوب صورت بچے تھے ہمارے پرتاپ اور دلیپ اور ہرنام کور بڑھتے بڑھتے بچے بھی بڑے ہو گئے۔ اور اسکول جانے لگے سکول سے کالج میں جانے لگے اور جب وہ کالج جانے لگے تو ہمارے ہاں تیسرا لڑکا پیدا ہوا۔ ہربنس سنگھ اب ہمارے بڑے بھرے گھر میں شادمانی اور مسرت تھی۔ آرام و سکون، خوشی اور یقین، گہری رفاقت اور مفاہمت جو اچھے گھروں کی مثال ہوتی ہے!

ایک روز میں شام کے وقت کھیتوں سے واپس آ کے گھر کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ پرتاپ اور دلیپ کالج سے واپس آ گئے تھے۔ گرمی کی چھٹیاں گذارنے کے لئے۔ ہرنام ایک کونے میں کشیدہ کاڑھ رہی تھی۔ میرا سات سال کا ہربنس لکڑی کے گھوڑے کو چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پرتیو گھر کے نیچے ایک کونے میں چولھے میں

مکئی کی روٹیاں سینک رہی تھی ۔ ہانڈی میں سرسوں کا ساگ ابل رہا تھا ۔ اور اس کی کھٹی کھٹی خوشبو میری بھوک اور بھی بے چین کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کرپان کھول کر الگ رکھ دی ۔ اور ہاتھ منہ دھو کر پرتیو کے سامنے مونڈھا بچھا کر بیٹھ گیا ۔ اور بالکل بچوں کی طرح بے چین ہو کر اس سے کھانا مانگنے لگا ۔

" پرتیو جلدی سے کھانا دے دے "!

پرتیو نے سب سے پہلے میرے لئے کھانا پروسا ۔ پھر پرتاپ کے لئے ۔ پھر دلیپ کے لئے ، پھر ہرنام کور کے لئے ۔ سب سے چھوٹے ہربنس نے مچل کر کہا ۔

" میں تو ماں کے ساتھ کھانا کھاؤں گا ۔"

میں نے پرتیو سے کہا "تو بھی بیٹھ جا اب!"

" میں بھی بیٹھ جاؤں گی تو تمہیں کھانا کون کھلائے گا؟" پرتیو نے ذرا ناک سیکڑ کر کہا ۔

اِس وقت چولھے کی روشنی میں اس کے رخسار تمتما اُٹھے تھے ، اور اُلجھی ہوئی زلف ماتھے پر اتر آئی تھی ۔ مجھے وہ اس وقت بہت اچھی لگ رہی تھی "۔

" ماں ! مجھے سرسوں کا ساگ اور دے دے " دلیپ نے اپنی تھالی آگے بڑھاتے ہوئے کہا ۔

پرتیو نے ہانڈی میں سے ساگ کی کڑچھی بھر کر اُسے دلیپ کی تھالی میں انڈیل دیا ۔

میں نے کہا " ہربنس کی ماں ! تھوڑا سا اچار اگر اس وقت کہیں سے

سے مل جائے تو کھانے کا مزہ دونا ہو جائے"
"اچار تو اندر کوٹھری میں ہے!" پرتیو نے رک رک کر کہا۔
"تو کیا ہوا۔ اندر سے جا کے لا دے۔"
پرتیو سہم کر بولی۔
"اکیلی کیسے جاؤں؟ اندر تو بڑا اندھیرا ہے مجھے ڈر لگتا ہے!"
"ڈر لگتا ہے"؟ یکایک میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "اسوقت سب کے سامنے اندر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ لیکن اس رات کو کھیتوں کو پار کر کے اکیلی جانے میں ڈر نہیں لگا تھا؟" یکایک میں نے تنک کر کہا۔ جانے کیسے کہہ دیا۔ اتنے سالوں تک جس بات کو کبھی نہ کہا تھا۔ کیسے وہ بات یوں ایک طعنہ بنکر اتنے سالوں کے بعد میرے ہونٹوں پر آگئی۔

پرتیو نے بیٹھے بیٹھے بس ایک لمحے کے لئے مجھے دیکھا دوسرے لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کرپان لئے میرے سر پر کھڑی ہے پھر ایک بجلی سی تڑپی۔ اور میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہاتھ اوپر اٹھائے۔

ایک بار، دو بار، تین بار کرپان میرے رخساروں کو کاٹتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لئے اپنے ہاتھوں سے روکنا چاہا۔ اور چلایا۔ پرتیو۔ پرتیو! رک جا مگر پرتیو ایک بھوکی شیرنی کی طرح مجھ پر وار کرتی رہی۔ آخر غصہ میں بھر کر میں نے ایک جھٹکے میں کرپان اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ اور دونوں ہاتھوں سے کرپان کو اٹھا کر اور اپنے جسم اور [illegible] [illegible] پوری طاقت سے پرتیو کی گردن پر بھرپور وار کر دیا۔ پرتیو

کی گردن کٹ کر ہربنس کے گھوڑے کے قدموں میں جا گری۔ اور وہاں سے لڑھک کر میری تھالی میں اوندھی ہو گئی۔ اور اس کے سیاہ بال کھل کر میرے سامنے بکھر گئے۔

بوڑھا سکھ چپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔ کھڑکی میں چاند بھی ایک وحشت ناک بھوت کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ گاڑی کے مسافروں کے چہرے سپید اور ستے ہوئے تھے۔ جیسے وہ چہرے نہ ہوں۔ بہروپیوں کے خول ہوں گاڑی کھیتوں میں سے گذرتی ہوئی کسی نامعلوم منزل کی طرف بڑھتی جا رہی تھی اور چاند۔ مجبور اور بے کس تنہا اور اکیلا، کھڑکی میں کھڑا تھا

بہت دیر کی خاموشی کے بعد بوڑھے سکھ نے دگیر لہجے میں کہا۔

"عورت کبھی نہیں بھولتی! وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسے ایک ڈولی میں سوار کرا کے، ایک پلنگ پر لٹا کر، چار بچے پیدا کرا کے، اس کے دل کا سپنا اس سے چھین سکتے ہیں۔ وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے!"

"عورت کبھی نہیں بھولتی!"

بوڑھا سکھ خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنے رخسار کی صلیب پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا اور خاموش ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ صلیب بہت گہری اس کے دل کے اندر ڈوب چکی ہے۔

گاڑی میں اس قدر سناٹا تھا کہ مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی میں نے منہ کھول کر دو تین لمبے لمبے سانس اندر کو لئے پھر اچانک میری نظر کونے میں سوئے ہوئے جوڑے پر پڑی۔

لڑکی کا ہاتھ ابھی لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ اور لڑکے کا بازو ابھی تک لڑکی کے شانے پر تھا۔ اور دونوں کی آنکھیں بند تھیں۔ اور دونوں سو رہے تھے۔ یکایک لڑکی نے لڑکے کے شانے سے سر اٹھایا آہستہ سے اپنا ہاتھ لڑکے کے سر کے نیچے سے نکالا۔ اور لڑکے کی طرف دیکھا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ لڑکا گہری نیند سو رہا ہے۔ تو لڑکی نے نوجوان کا بازو اپنے شانے سے الگ کیا اور اس سے منہ پھیر کر چاند کی طرف دیکھا۔ پھر ایسی حسرت آمیز التجا سے دیکھا جو اس کی گلنار مسکراہٹ کی ہر قدم پر تکذیب کرتی تھی۔ میں بالکل ہوچکا رہ گیا۔ یکایک میرے ذہن میں ایک کرن سی لہلہاتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں نے ڈر کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

دوسرے لمحے میں جب میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو لڑکی نے اپنی کھڑکی کا پردہ گرا لیا تھا۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ گو میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

کالو بھنگی

میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگی کے بارے میں لکھنا چاہا ہے لیکن میرا قلم ہر بار یہ سوچ کر رک گیا ہے کہ کالو بھنگی کے متعلق لکھا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے، پرکھنے، سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دکھائی نہیں دیتی، جس سے دلچسپ افسانہ مرتب ہو سکتا ہے، دلچسپ ہونا تو درکنار، کوئی سیدھا سادا افسانہ بے کیف و بے رنگ، بے جان مرقع بھی تو نہیں لکھا جا سکتا، کالو بھنگی سے متعلق۔ پھر نہ جانے کیا بات ہے، ہر افسانے کے شروع میں میرے ذہن میں کالو بھنگی آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے مسکرا کر پوچھتا ہے "چھوٹے صاحب! مجھ پر کہانی نہیں

لکھو گے؟ ـــــــ کتنے سال ہو گئے۔ تمہیں لکھتے ہوئے؟"
"آٹھ سال۔"
"کتنی کہانیاں لکھیں تم نے؟"
"ساٹھ اور دو باسٹھ۔"

"مجھ میں کیا برائی ہے چھوٹے صاحب، تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تمہارے ذہن کے ایک کونے میں مدت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں۔ چھوٹے صاحب، میں تو تمہارا پرانا حلال خور ہوں، کالو بھنگی، آخر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟"

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس قدر سیدھی سپاٹ زندگی رہی ہے۔ کالو بھنگی کی کہ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا اس کے متعلق۔ یہ نہیں کہ میں اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی نہیں چاہتا، دراصل میں کالو بھنگی کے متعلق لکھنے کا ارادہ ایک مدت سے کر رہا ہوں۔ لیکن کبھی لکھ نہیں سکا۔ ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکا۔ اس لئے آج تک کالو بھنگی اپنی پرانی جھاڑو لئے، اپنے بڑے بڑے ننگے گھٹنے لئے، اپنے پھٹے پھٹے کھردرے بد ہیت پاؤں لئے اپنی سوکھی ٹانگوں پر ابھری دردیدیں لئے، اپنے کولہوں کی ابھری ابھری ہڈیاں لئے، اپنے بھوکے پیٹ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لئے، اپنے مرجھائے ہوئے سینے پر گرد آلود بالوں کی جھاڑیاں لئے، اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں، پھیلے پھیلے نتھنوں جھرلوں، اپنے گال اور اپنی آنکھوں کے نیم تاریک گڑھوں کے

اور بر ننگی چندیا ابھارے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے۔ اب تک کئی آئے اور اپنی زندگی بتا کر، اپنی اہمیت جتا کر، اپنی ڈرامائیت ذہن نشین کرا کے چلے گئے۔ حسین عورتیں، خوب صورت تخیلی ہیولے، شیطان کے چہرے اس کے ذہن کے رنگ و روغن سے آشنا ہوئے، اس کی چار دیواری میں اپنے دیئے جلا کر چلے گئے لیکن کالو بھنگی بدستور اپنی جھاڑو سنبھالے اسی طرح کھڑا ہے۔ اس نے اس گھر کے اندر والے ہر کردار کو دیکھا ہے اسے روتے ہوئے گڑگڑاتے ہوئے، محبت کرتے ہوئے، نفرت کرتے ہوئے، سوتے ہوئے، جاگتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے، تقریر کرتے ہوئے، زندگی کے ہر رنگ میں، ہر نہج سے ہر منزل میں دیکھا ہے۔ بچپن سے بڑھاپے سے موت تک، اس نے ہر اجنبی کو اس گھر کے دروازے کے اندر جھانکتے دیکھا ہے اور اسے اندر آتے ہوئے اس کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ وہ خود پرے ہٹ گیا ہے ایک بھنگی کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ داستان شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ کردار اور تماشائی دونوں رخصت ہو گئے ہیں لیکن کالو بھنگی اس کے بعد بھی وہیں کھڑا ہے۔ اب صرف ایک قدم اس نے آگے بڑھا لیا ہے اور ذہن کے مرکز میں آگیا ہے۔ تاکہ میں اسے اچھی طرح دیکھ لوں، اس کی ننگی چندیا چمک رہی ہے اور ہونٹوں پر ایک خاموش سوال ہے، ایک عرصے سے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں گا اس کے بارے میں لیکن آج یہ بھوت ایسے مانے گا نہیں، اسے کئی سالوں تک ٹالا ہے، آج اسے بھی الوداع کہہ دیں..........؟

*

میں سات برس کا تھا، جب میں نے کالو بھنگی کو پہلی بار دیکھا۔ اس کے بیس برس بعد جب وہ مرا، میں نے اسے اسی حالت میں دیکھا۔ کوئی فرق نہ تھا۔ وہی گھٹنے، وہی پاؤں، وہی چہرہ، وہی چندیا، وہی ٹوٹے ہوئے دانت، جھاڑو جو ایسا معلوم ہوتا تھا، ماں کے پیٹ سے اٹھائے چلا آرہا ہے، کالو بھنگی کی جھاڑو اس کے جسم کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر روز مریضوں کا بول و براز صاف کرتا تھا۔ ڈسپنسری میں فینائل چھڑکتا تھا۔ پھر ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا۔ کمپونڈر صاحب کی بکری اور ڈاکٹر صاحب کی گائے کو چرانے کے لئے جنگل میں لے جاتا اور دن ڈھلتے ہی انھیں واپس ہسپتال میں لے آتا اور مویشی خانے میں باندھ کر اپنا کھانا تیار کرتا اور اسے کھا کر سو جاتا۔ بیس سال سے اسے میں یہی کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر روز، بلاناغہ۔ اس عرصے میں وہ کبھی ایک دن کے لئے بھی بیمار نہیں ہوا۔ یہ امر تعجب خیز ضرور تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ محض اسی کے لئے ایک کہانی لکھی جائے۔ خیر یہ کہانی تو زبردستی لکھوائی جارہی ہے۔ آٹھ سال سے میں اسے ٹالتا آیا ہوں۔ لیکن یہ شخص نہیں مانتا۔ زبردستی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ظلم مجھ پر بھی ہے اور آپ پر بھی۔ مجھ پر اس لئے کہ مجھے لکھنا پڑ رہا ہے۔ آپ پر اس لئے کہ آپ کو اسے پڑھنا پڑ رہا

ہے درحالیکہ اس میں کوئی ایسی بات ہی نہیں جس کے لئے اس کے متعلق اتنی دردسری مول لی جائے، مگر کیا کیا جائے کالو بھنگی کی خاموش نگاہوں کے اندر ایک ایسی گھٹی گھٹی سی ملتجیانہ کاہش ہے۔ ایک ایسی مجبور بے زبانی ہے، ایک ایسی مجبور گرانی ہے کہ مجھے اس کے متعلق لکھنا پڑ رہا ہے۔ اور لکھتے لکھتے یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس کی زندگی کے متعلق کیا لکھوں گا میں۔ کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو دلچسپ ہو۔ کوئی کونہ ایسا نہیں جو تاریک ہو، کوئی زاویہ ایسا نہیں جو مقناطیسی کشش کا حامل ہو۔ ہاں آٹھ سال سے متواتر میرے ذہن میں کھڑا ہے، نہ جانے کیوں۔ اس میں اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ جب میں نے آنگی کے افسانے میں چاندنی کے کھلیان سجائے تھے اور رومانیت کے رومانی نظریئے سے دنیا کو دیکھا تھا۔ اس وقت بھی یہ وہیں کھڑا تھا۔ جب میں نے رومانیت سے آگے سفر اختیار کیا اور حسن اور حیوان کی بوقلموں کیفیتیں دیکھتا ہوا ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھونے لگا اس وقت بھی یہ وہیں تھا۔ جب میں نے بالکونی سے جھانک کر ان داتاؤں کی غربت دیکھی۔ اور پنجاب کی سرزمین پر خون کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے وحشی ہونے کا علم حاصل کیا۔ اس وقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ صم بکم۔ مگر اب یہ جائے گا ضرور۔ اب کے اسے جانا ہی پڑے گا۔ اب میں اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ للہ اس کی بے کیف، بے رنگ، پھیکی سیٹھی کہانی بھی سن لیجئے تاکہ یہ یہاں سے دور دفان ہو جائے، اور مجھے اس کے غلط قرب سے نجات ملے، اور اگر آج

بھی میں نے اس کے بارے میں نہ لکھا، اور نہ آپ نے اسے پڑھا تو یہ آٹھ سال بعد بھی یہیں جا رہے گا۔ اور ممکن ہے زندگی بھر یہیں کھڑا رہے۔

لیکن پریشانی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جا سکتا ہے۔

کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے، اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے سارے آبا و اجداد بھنگی تھے، اور سینکڑوں برس سے یہیں رہتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح، اسی حالت میں۔ پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی۔ اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا۔ اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا۔ وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا۔ اور صبح اٹھ کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ بچپن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آیا تھا۔

ہاں کالو بھنگی میں ایک بات ضرور دلچسپ تھی۔ اور وہ یہ کہ اسے اپنی تنگی چندیا پر کسی جانور، مثلاً گائے یا بھینس کی زبان پھرانے سے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اکثر دوپہر کے وقت میں نے اسے دیکھا ہے کہ نیلے آسمان تلے، سبز گھاس کے مخملیں فرش پر کھلی دھوپ میں وہ ہسپتال کے قریب ایک کھیت کی مینڈھ پر اکڑوں بیٹھا ہے اور گائے ...... اس کا سر چاٹ رہی ہے۔ بار بار۔ اور وہ وہیں اپنا سر جھکائے جھکائے اونگھتا اونگھتا سو گیا ہے۔ اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں مسرت کا ایک عجیب سا احساس اجاگر ہونے لگتا تھا۔ اور کائنات کے تھکے تھکے، غنودگی آمیز آفاقی حسن کا گمان ہونے لگتا تھا۔ میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دنیا کو حسین ترین عورتیں پھولوں کے تازہ ترین غنچے، کائنات کے خوب صورت

ترین مناظر دیکھے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں ایسی معصومیت، ایسا حسن، ایسا سکون کسی منظر میں نہیں دیکھا۔ جتنا اس منظر میں کہ جب میں سات برس کا تھا اور وہ کھیت بہت بڑا اور وسیع دکھائی دیتا تھا اور آسمان بہت نیلا اور صاف، اور کالو بھنگی کی چندیا شیشے کی طرح چمکتی تھی، اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اس کی چندیا چاٹتی ہوئی۔ ایسے گویا سہلاتی ہوئی کھر کھر کی خوابیدہ آواز پیدا کرتی جاتی تھی، جی چاہتا تھا، میں بھی اسی طرح اپنا سر گھٹا کے اس گائے کے نیچے بیٹھ جاؤں اور اونگھتا اونگھتا سو جاؤں، ایک دفعہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو والد صاحب نے مجھے وہ پیٹا وہ پیٹا اور مجھ سے زیادہ غریب کالو بھنگی کو پیٹا کہ میں خود ڈر کے مارے چیخنے لگا کہ کالو بھنگی کہیں ان کی ٹھوکروں سے مر نہ جائے۔ لیکن کالو بھنگی کو اتنی مار کھا کے بھی کچھ نہ ہوا، دوسرے روز وہ بدستور جھاڑو دینے کے لئے ہمارے بنگلے میں موجود تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ہماری گائے تو اس پر جان چھڑکتی تھی۔ اور کمپونڈر صاحب کی بکری بھی۔ حالانکہ بکری بڑی بے وفا ہوتی ہے، عورت سے بھی بڑھ کے۔ لیکن کالو بھنگی کی بات اور تھی، ان دونوں جانوروں کو پانی پلائے تو کالو بھنگی اور رات کو مویشی خانے باندھے تو کالو بھنگی، وہ اس کے ایک ایک اشارے کو اس طرح سمجھ جاتیں۔ جس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچے کی باتیں سمجھتا ہے میں کئی بار کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں، جنگل میں راستے میں وہ انھیں بالکل کھلا چھوڑ دیتا ہے لیکن پھر بھی گائے اور بکری دونوں

اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چلے آتے تھے، گویا تین دوست سیر کرنے نکلے ہیں۔ راستے میں گائے نے سبز گھاس دیکھ کر منہ مارا تو بکری بھی جھاڑی سے پتیاں کھانے لگتی اور کالو بھنگی ہے کہ سنبل توڑ توڑ کے کھا رہا ہے اور بکری کے منہ میں ڈال رہا ہے۔ اور خود بھی کھا رہا ہے اور آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے، اور ان سے بھی برابر باتیں کئے جا رہا ہے۔ اور وہ دونوں جانور بھی کبھی غرا کر کبھی کان پھڑپھڑا کر، کبھی پاؤں ہلا کر، کبھی دم دبا کر، کبھی ناچ کر، کبھی گا کر، ہر طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہو رہے ہیں۔ اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ کیا باتیں کرتے تھے، پھر چند لمحوں کے بعد کالو بھنگی آگے چلنے لگتا تو گائے بھی چرنا چھوڑ دیتی اور بکری بھی جھاڑی سے پرے ہٹ جاتی اور کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ آگے کہیں چھوٹی سی ندی آتی یا کوئی ننھا ننھا چشمہ، تو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا بلکہ لیٹ کر وہیں چشمے کی سطح سے اپنے ہونٹ ملا دیتا۔ اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگتا اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے کیونکہ بیچارے انسان تو نہیں تھے کہ اوک سے پی سکتے، اس کے بعد اگر کالو بھنگی سبزے پر لیٹ جاتا تو بکری بھی اس کی ٹانگوں کے پاس اپنی ٹانگیں سکیڑ کر دعائیہ انداز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس انداز سے قریب ہو بیٹھتی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ کالو بھنگی کی بیوی ہے اور ابھی ابھی کھانا پکا کے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی ہر نگاہ میں وہ جذبے کے ہر اتار چڑھاؤ میں ایک سکون آمیز گرہستی

انداز جھلکنے لگتا، اور جب وہ جگالی کرنے لگتی تو مجھے معلوم ہوتا گویا کوئی بڑی سگھڑ بیوی کروشیا لئے سوزن کاری میں مصروف ہے اور کالو بھنگی کا سوئٹر بن رہی ہے۔

اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کتا تھا جو کالو بھنگی کا بڑا دوست تھا۔ وہ لنگڑا تھا اور اس لئے دوسرے کتوں کے ساتھ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا۔ اور اکثر اپنے لنگڑے ہونے کی وجہ سے دوسرے کتوں سے پٹتا اور بھوکا رہتا، اور زخمی رہتا۔ کالو بھنگی اکثر اس کی تیمارداری اور خاطر و تواضع میں لگا رہتا، کبھی تو صابن سے اسے نہلاتا، کبھی اس کی چیچڑیاں دور کرتا، اس کے زخموں پر مرہم لگاتا، اسے مکی کی روٹی کا سوکھا ٹکڑا دیتا، لیکن یہ کتا بڑا خودغرض جانور تھا۔ دن میں صرف دو مرتبہ بھنگی سے ملتا۔ دوپہر کو اور شام کو، اور کھانا کھا کے اور زخموں پر مرہم لگوا کے پھر گھومنے کے لئے چلا جاتا کالو بھنگی اور اس لنگڑے کتے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی اور بڑی دلچسپ، مجھے تو وہ کتا ایک آنکھ نہ بھاتا، لیکن کالو بھنگی اسے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتا تھا۔

اس کے علاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور چرند اور پرند سے شناسائی تھی۔ راستے میں اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا آجاتا تو وہ اسے اٹھا کر جھاڑی پر رکھ دیتا، کہیں کوئی نیولا بولنے لگتا تو یہ اس کی بولی میں اس کا جواب دیتا، تیتر، رت گلہ، گٹاری لال چڑا، سبزہ مکھی، ہر پرندے کی زبان وہ جانتا تھا۔ اس لحاظ سے

وہ گوپال سنکرتائیں سے بھی بڑا پنڈت تھا۔ کم ازکم میرے جیسے سات برس کے بچے کی نظروں میں تو وہ مجھے اپنے ماں باپ سے بھی اچھا معلوم ہوتا تھا اور پھر وہ مکی کا بھٹا ایسے مزے کا تیار کرتا تھا، اور آگ پر اسے اس طرح مدھم آنچ پر بھونتا تھا کہ مکی کا ہر دانہ کندن بن جاتا، اور ذائقے میں شہد کا مزا دیتا، اور خوشبو بھی ایسی سوندھی سوندھی، میٹھی میٹھی، جیسے دھرتی کی سانس! نہایت آہستہ آہستہ بڑے سکون سے، بڑی مشاقی سے وہ بھٹے کو ہر طرف سے دیکھ دیکھ کر اسے بھونتا تھا، جیسے وہ برسوں سے اس بھٹے کو جانتا تھا۔ اک دوست کی طرح وہ بھٹے سے باتیں کرتا، اتنی نرمی اور مہربانی اور شفقت سے اس سے پیش آتا گویا وہ بھلا اس کا اپنا رشتہ دار یا سگا بھائی تھا۔ اور لوگ بھی بھٹا بھونتے تھے مگر وہ بات کہاں، اس قدر کچے، بد ذائقہ اور معمولی سے بھٹے ہوتے تھے، وہ کہ انہیں بس مکی کا بھٹا ہی کہا جا سکتا ہے لیکن کالو بھنگی کے ہاتھوں میں پہنچ کے وہی بھٹا کچھ کا کچھ ہو جاتا، اور جب وہ آگ پر سینک کے بالکل تیار ہو جاتا تو بالکل اک نئی نویلی دلہن کی طرح عروسی لباس پہنے سنہرا سنہرا چکتا نظر آتا۔ میرے خیال میں خود بھٹے کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کالو اس سے کتنی محبت کرتا ہے، ورنہ محبت کے بغیر اس بے جان شے میں اتنی رعنائی کیسے پیدا ہو سکتی تھی۔ مجھے کالو بھنگی کے ہات کے سینکے ہوئے بھٹے کھانے میں بڑا مزا آتا تھا۔ اور میں انہیں بڑے مزے میں چھپ چھپ کے کھاتا تھا،

ایک دفعہ پکڑا گیا تو بڑی ٹھکائی ہوئی۔ بری طرح، بے چارا کالو بھنگی بھی پٹا مگر دوسرے دن وہ پھر بنگلے پر جھاڑو لئے اسی طرح حاضر تھا۔

اور بس کالو بھنگی کے متعلق کوئی دلچسپ بات یاد نہیں آرہی۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو بھنگی اسی طرح رہا، میرے لئے اب وہ کم دلچسپ ہو گیا تھا۔ بلکہ یوں کہیے کہ مجھے اس سے کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی، ہاں کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اپنی طرف کھینچتا۔ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں مطالعہ کے لئے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کے لئے فاؤنٹن پن اور پیڈ ساتھ رکھ لیتا۔

"کالو بھنگی تمہاری زندگی میں کوئی خاص بات ہے؟"

"کیسی چھوٹے صاحب؟"

"کوئی خاص بات، عجیب، انوکھی نئی"

"نہیں چھوٹے صاحب" (یہاں تک تو مشاہدہ صفر رہا، اب آگے چلئے ممکن ہے ....!

"اچھا تم یہ بتاؤ تم تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟" ہم نے دوسرا سوال پوچھا۔

"تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں" وہ سوچنے لگتا "آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے" پھر وہ انگلیوں پر گننے لگتا "چار روپے کا آٹا لاتا ہوں ...... ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مسالحہ، کتنے روپے ہو گئے چھوٹے صاحب؟"

"سات روپے۔"

"ہاں سات روپے، ہر مہینے ایک روپیہ بنئے کو دیتا ہوں اس سے کپڑے سلوانے کے لئے روپے کرج لیتا ہوں نا، سال میں دو جوڑے تو چاہئیں، کمبل تو میرے پاس ہے، خیر لیکن دو جوڑے تو چاہئیں، اور چھوٹے صاحب، کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ میں بڑھا دیں تو مجا آ جائے۔"

"وہ کیسے؟"

"گھی لاؤں گا ایک روپے کا، اور مکی کے پراٹھے کھاؤں گا۔ کبھی پراٹھے نہیں کھائے مالک، بڑا جی چاہتا ہے۔"

اب بولئے ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہو گئی، جب راتیں جوان اور چکدار ہونے لگیں اور قریب کے جنگل سے شہد اور کستوری اور جنگلی گلاب کی خوشبوئیں آنے لگیں اور ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے دکھائی دیتے اور تارے جھکتے جھکتے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور کسی کے رسیلے ہونٹ آتے والے بوسوں کا خیال کر کے کانپنے لگتے، اس وقت بھی میں کالو بھنگی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا اور پنسل کاغذ لے کے اس کے پاس جاتا۔

"کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا؟"

"نہیں چھوٹے صاحب"

"کیوں؟"

"اس علاقے میں ہی ایک بھنگی ہوں۔ اور دور دور تک کوئی

بھنگی نہیں ہے چھوٹے صاحب، پھر ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے!"
(لیجیئے یہ راستہ بھی بند ہوا)

"تمہارا جی نہیں چاہتا کالو بھنگی؟" میں نے دوبارہ کوشش کر کے کچھ کریدنا چاہا۔

"کیا صاحب؟"

"عشق کرنے کے لئے جی چاہتا ہے تمہارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہوگی تم نے، جبھی تم نے اب تک شادی نہیں کی؟"

"عشق کیا ہوتا ہے چھوٹے صاحب؟"

"عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ"

"عشق کیسے کرتے ہیں صاحب؟ شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ، بڑے لوگ عشق بھی کرتے ہوں گے چھوٹے صاحب۔ مگر ہم نے نہیں سنا وہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، رہی شادی کی بات، وہ میں نے آپ کو بتادی۔ شادی کیوں نہیں کی میں نے، کیسے ہوتی شادی میری، آپ بتلایئے؟" ...... (ہم کیا بتائیں خاک) تمہیں افسوس نہیں ہے کالو بھنگی؟"

"کس بات کا افسوس؟ چھوٹے صاحب"

میں نے ہار کر اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

آٹھ سال ہوئے کالو بھنگی مر گیا۔ وہ جو کبھی بیمار نہیں ہوا تھا، اچانک ایسا بیمار پڑا کہ پھر کبھی بستر علالت سے نہ اٹھا، اسے ہسپتال میں مریض

رکھوادیا تھا۔ وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا کمپونڈر صدرسے اس کے حلق میں دوا انڈیل دیتا۔ اور ایک چپراسی اس کے لئے کھانا رکھ آتا، وہ اپنے برتن خود صاف کرتا، اپنا بستر خود کرتا، اپنا بول و براز خود صاف کرتا۔ اور جب وہ مرگیا تو اس کی لاش کو پولیس والوں نے ٹھکانے لگا دیا۔ کیونکہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ وہ ہمارے ہاں بیس سال سے رہتا تھا۔ لیکن ہم کوئی اس کے رشتے دار تھوڑی تھے۔ اس لئے اس کی آخری تنخواہ بھی بحق سرکار ضبط ہوگئی۔ کیونکہ کوئی اس کا وارث نہ تھا اور جب وہ مرا اس روز بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ روز کی طرح اس روز بھی ہسپتال کھلا۔ ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے، کمپونڈر نے تیار کئے مریضوں نے دوا لی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا۔ اور گھر آن کر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا۔ ریڈیو سنا اور لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے ازراہ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی، اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کمپونڈر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا، اور وارڈ کے باہر کھڑے کھڑے بے کار چلاتی رہیں جانوروں کی ذات ہے نا آخر۔

ارے تو پھر جھاڑو لے کر آن پہنچا! آخر کیا چاہتا ہے؟ بتا دے۔

کالو بھنگی ابھی تک وہیں کھڑا ہے۔

کیوں بھئی، اب تو میں نے سب کچھ لکھ دیا، وہ سب کچھ جو میں تمہاری بابت جانتا ہوں۔ اب بھی یہیں کھڑے ہو۔ پریشان کر رہے ہو۔ للہ چلے جاؤ۔ کیا مجھ سے کچھ چھوٹ گیا ہے۔ کوئی بھول ہو گئی ہے؟ تمہارا نام۔ کالو بھنگی۔ کام۔ بھنگی۔ اس علاقے سے کبھی باہر نہیں گئے۔ شادی نہیں کی۔ عشق نہیں لڑایا۔ زندگی میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہوئی۔ کوئی اچنبھا، معجزہ نہیں ہوا۔ جیسے محبوبہ کے ہونٹوں میں ہوتا ہے، اپنے بچے کے پیار میں ہوتا ہے۔ غالب کے کلام میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تمہاری زندگی میں۔ پھر میں کیا لکھوں۔ اور کیا لکھوں؟ تمہاری تنخواہ آٹھ روپے، چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، اور ایک روپیہ بنئے کا، آٹھ روپے ہو گئے۔ مگر آٹھ روپے میں کہانی نہیں ہوتی، آج کل تو پچیس۔ پچاس۔ سو میں بھی ہوتی۔ مگر آٹھ روپے میں تو کسی طرح کوئی کہانی نہیں ہو سکتی۔ پھر میں کیا لکھ سکتا ہوں تمہارے بارے میں۔ اب خلجی ہی کو لو۔ ہسپتال میں کمپونڈر ہے۔ تیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔ وراثت سے نچلے متوسط طبقے کے ماں باپ ملے تھے، جنھوں نے مڈل تک پڑھا دیا۔ پھر خلجی نے کمپونڈری کا امتحان پاس کر لیا۔ وہ جوان ہے، اس کے چہرے پر رنگت ہے۔ جوانی، یہ رنگت کچھ چاہتی ہے، وہ سفید لٹھے کی شلوار پہن سکتا ہے۔ قمیض پر کلف لگا سکتا ہے۔ بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کر سکتا ہے۔ سرکار نے اسے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا بنگلہ نما کوارٹر بھی دے رکھا ہے۔ ڈاکٹر چوک جائے تو نسیں بھی

بھاڑ لیتا ہے اور خوب صورت مریضاؤں سے عشق بھی کر لیتا ہے وہ نوراں اور خلی کا واقعہ تمہیں یاد ہوگا۔ نوراں بھیتا سے آئی تھی۔ سولہ سترہ برس کی الھڑ جوانی، چار کوس سے سینما کے رنگین اشتہار کی طرح نظر آتی تھی۔ بڑی بے وقوف تھی وہ اپنے گاؤں کے دو نوجوانوں کا عشق قبول کئے بیٹھی تھی۔ جب نمبردار کا لڑکا سامنے آجاتا تو اس کی ہو جاتی: اور جب پٹواری کا لڑکا دکھائی دیتا تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہونے لگتا اور وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر سکی تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ ایک بالکل واضح، قاطع، یقینی امر سمجھتے ہیں۔ درحالیکہ یہ عشق اکثر بڑا متذبذب، غیر یقینی، گومگو حالت کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی عشق اُس سے بھی ہے اِس سے بھی ہے۔ اور پھر شاید کہیں نہیں ہے۔ اور ہے بھی تو اس قدر وقتی، گرگٹ، ہنگامی، کہ ادھر نظر چوکی ادھر عشق غائب۔ سچائی ضرور ہوتی ہے لیکن ابدیت مفقود ہوتی ہے اسی لئے تو نوراں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اس کا دل نمبردار کے بیٹے کے لئے بھی دھڑکتا تھا۔ اور پٹواری کے پوت کے لئے بھی۔ اس کے ہونٹ نمبردار کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کے لئے بیتاب ہو اٹھتے اور پٹواری کے پوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اس کا دل یوں کانپنے لگتا ہے جیسے چاروں طرف سمندر ہو چاروں طرف لہریں ہوں، اور ایک اکیلی کشتی ہو اور نازک سی پتوار ہو اور چاروں طرف کوئی نہ ہو، اور کشتی ڈولنے لگے، ہولے ہولے ڈولتی جائے، اور نازک سی پتوار نازک سے ہاتھوں سے چلتی چلتی تھم جائے، اور سانس رکتے رکتے رک سی جائے اور آنکھیں جھکتی جھکتی جھک سی جائیں اور زلفیں بکھرتے بکھرتے بکھر سی جائیں، اور لہریں گھوم گھوم کر گھومتی ہوئی معلوم دیں۔ اور بڑے بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے پھیل جائیں، اور پھر چاروں طرف سناٹا پھیل جائے

اور دل ایک دم دھک سے رہ جائے۔ اور کوئی اپنی بانہوں میں بھینچ لے۔ ہائے پٹواری کے بیٹے کو دیکھنے سے ایسی حالت ہوتی تھی نوراں کی۔ اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی۔ نمبردار کا بیٹا۔ پٹواری کا بیٹا۔ پٹواری کا بیٹا، نمبردار کا بیٹا، وہ دونوں کو زبان دے چکی تھی۔ دونوں سے شادی کرنے کا اقرار کر چکی تھی۔ دونوں پر مرمٹی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپس میں لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے، اور جب جوانی کا بہت سا لہو رگوں سے نکل گیا تو انھیں اپنی بے وقوفی پر بڑا غصہ آیا، اور پہلے نمبردار کا بیٹا نوراں کے پاس پہونچا، اور اپنی چھری سے اسے ہلاک کرنا چاہا۔ اور نوراں کے بازو پر زخم آگئے، اور پھر پٹواری کا پوت آیا، اور اس نے اس کی جان لینی چاہی۔ اور نوراں کے پاؤں پر زخم آگئے مگر وہ بچ گئی، کیونکہ وہ بروقت ہسپتال لائی گئی تھی۔ اور یہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ آخر ہسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں، خوب صورتی دلوں پر اثر کرتی ہے۔ انجکشن کی طرح۔ تھوڑا بہت اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ کسی پر کم، کسی پر زیادہ۔ ڈاکٹر صاحب پر کم تھا۔ کمپونڈر پر زیادہ تھا نوراں کی تیمارداری میں خلجی دل و جان سے لگا رہا۔ نوراں سے پہلے بیگماں، بیگماں سے پہلے ریشماں، اور ریشماں سے پہلے جانکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا مگر وہ خلجی کے ناکام معاشقے تھے کیونکہ وہ عورتیں بیاہی ہوئی تھیں۔ ریشماں کا تو ایک بچہ بھی تھا، بچوں کے علاوہ ماں باپ تھے، اور خاوند تھے۔ اور خاوندوں کی دشمن نگاہیں تھیں۔ جو گویا خلجی کے سینے کے اندر گھس کے اس کی خواہشوں کے آخری کونے تک پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ خلجی کیا کر سکتا تھا۔ مجبور ہو کے رہ جاتا اس نے بیگماں

سے عشق کیا ریشماں سے اور جانکی سے بھی۔ وہ ہر روز بیگیاں کے بھائی کو مٹھائی کھلاتا تھا۔ ریشماں کے ننھے بیٹے کو دن بھر اٹھائے پھرتا تھا جانکی کو بھوری سے بڑی محبت تھی۔ وہ ہر روز صبح اٹھ کے منہ اندھیرے جنگل کی طرف چلا جاتا۔ اور خوب صورت لالہ کے گچھے توڑ کر اس کے لئے لاتا۔ بہترین دوائیں، بہترین غذائیں، بہترین تیمارداری، لیکن جب آنے پر جب بیگیاں اچھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کے چلی گئی۔ اور جانکی اچھی ہوئی تو چلتے وقت اس نے خلجی کے دیئے ہوئے پھول اپنے سینے سے لگائے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ تھام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی اوٹ میں غائب ہوگئی۔ گھاٹی کے آخری کنارے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر خلجی کی طرف دیکھا اور خلجی منہ پھیر کر وارڈ کی دیوار سے لگ کر رونے لگا ریشماں کے رخصت ہوتے وقت بھی وہ اسی طرح رویا تھا۔ بیگیاں کے جاتے وقت بھی اسی شدت، اسی خلوص، اسی اذیت کے کربناک احساس سے مجبور ہو کر رویا تھا۔ لیکن خلجی کے لئے نہ ریشماں رکی، نہ بیگیاں، نہ جانکی، اور پھر اب کتنے سالوں کے بعد نوراں آئی تھی۔ اور اس کا دل اسی طرح دھڑکنے لگا تھا، اور یہ دل کن روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی، شروع میں تو نوراں کی حالت غیر تھی؛ بس کا بچنا محال تھا، مگر خلجی کی انتھک کوششوں سے زخم بھرتے چلے گئے، پیپ کم ہوتی گئی، سرانڈ دور ہوتی گئی، سوجن غائب ہو گئی۔ نوراں کی آنکھوں میں چمک اور اس کے سپید چہرے پر صحت کی سرخی آتی گئی۔ اور جس روز خلجی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اتاری تو نوراں بے اختیار

اک اظہارِ تشکر کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اور جب اس کے پاؤں کی پٹی اتری تو اس نے اپنے پاؤں میں مہندی رچائی اور ہاتھوں پر، اور آنکھوں میں کاجل لگایا اور بالوں کی زلفیں سنواریں تو خلجی کا دل مسرت سے چوکڑیاں بھرنے لگا، نوراں خلجی کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس نے خلجی سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ نمبر دار کا بیٹا اور پٹواری کا بیٹا دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کے لئے، اس سے معافی مانگنے کے لئے، اس سے شادی کا پیماں کرنے کے لئے ہسپتال آئے تھے اور نوراں انھیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی، کانپنے لگتی، مڑ مڑ کے دیکھنے لگتی اور اس وقت تک اسے چین نہ آتا جب تک وہ لوگ چلے نہ جاتے اور خلجی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں نہ لیتا، اور جب وہ بالکل اچھی ہو گئی تو سارا گاؤں اس کا اپنا گاؤں اسے دیکھنے کے لئے امڈ پڑا۔ گاؤں کی چھوری اچھی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کی مہربانی سے، اور نوراں کے ماں باپ بچھے جاتے تھے، اور آج تو نمبر دار بھی آیا تھا۔ اور پٹواری بھی۔ اور وہ دونوں خردماغ لڑکے بھی جو اب نوراں کو دیکھ دیکھ کے اپنے کئے پر پشیماں ہو رہے تھے، اور پھر نوراں نے اپنی ماں کا سہارا لیا۔ اور کاجل میں تیرتی ہوئی ڈبڈبائی آنکھوں سے خلجی کی طرف دیکھا۔ اور چپ چاپ اپنے گاؤں چلی گئی۔ سارا گاؤں اسے لینے کے لئے آیا تھا اور اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے نمبر دار کے بیٹے اور پٹواری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم اور دوسرے قدم اور سینکڑوں

تو ہم جولوں کے ساتھ چل رہے تھے۔ خلجی کے سینے کی گھاٹی پر سے گزرتے گئے، اور پیچھے ایک دھندلی گرد وغبار سے اٹی رہ گزر چھوڑ گئے۔
اور کوئی وارڈ کی دیوار کے ساتھ لگ کے سسکیاں لینے لگا۔

بڑی خوب صورت رومانی زندگی تھی خلجی کی، جو بڑل باس تھا۔ بتیس روپے تنخواہ پاتا تھا۔ پندرہ بیس اوپر سے کما لیتا تھا۔ خلجی جو جوان تھا۔ جو محبت کرتا تھا، جو اک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا جو اچھے ادیبوں کے افسانے پڑھتا تھا۔ اور عشق میں رہتا تھا۔ کس قدر دلچسپ اور رومانی اور پرکیف زندگی تھی خلجی کی۔ لیکن کالو بھنگی کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ:۔

۱۔ کالو بھنگی نے بکریاں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئی پٹیاں دھوئیں۔
۲۔ کالو بھنگی نے بکریاں کا بول و براز صاف کیا۔
۳۔ کالو بھنگی نے ریشماں کی غلیظ پٹیاں صاف کیں۔
۴۔ کالو بھنگی ریشماں کے بیٹے گوکی کے ہٹے کھلاتا تھا۔
۵۔ کالو بھنگی نے جانکی کی گندی پٹیاں دھوئیں۔ اور ہر روز اس کے کمرے میں فینائل چھڑکتا رہا۔ اور شام سے پہلے وارڈ کی کھڑکی بند کرتا رہا، اور آتشدان میں لکڑیاں جلاتا رہا تاکہ جانکی کو سردی نہ لگے۔

۶ - کالو بھنگی نوراں کا پاخانہ اٹھاتا رہا۔ تین ماہ دس روز تک۔

کالو بھنگی نے ریشماں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے جانکی کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے بگیاں کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن وہ کبھی دیوار سے لگ کر نہیں رویا۔ وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کے لئے حیران ہو جاتا۔ پھر اسی حیرت سے اپنا سر کھجانے لگتا۔ اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ ہنستا ہنستا نیچے کھیتوں میں چلا جاتا اور گانے سے اپنی جندیا چڑانے لگتا۔ لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں، پھر اور کیا لکھوں تمہارے بارے میں کالو بھنگی، سب کچھ تو کہہ دیا جو کچھ کہنا تھا۔ جو کچھ تم رہے ہو، تمہاری تنخواہ تیس روپے ہوتی، تم مڈل پاس یا فیل، تمہیں درانت میں کچھ کلچر، تہذیب، کچھ تھوڑی سی انسانی مسرت اور اس مسرت کی بلندی ملی ہوتی، تو میں تمہارے متعلق کوئی کہانی لکھتا۔ اب تمہارے آٹھ روپے ہیں، میں کیا کہانی لکھوں۔ ہر بار ان آٹھ روپوں کو الٹ پھیر کے دیکھتا ہوں۔ چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، اور ایک روپیہ بنئے کا، آٹھ روپے ہو گئے۔ کیسے کہانی بنے گی تمہاری کالو بھنگی، تمہارا افسانہ مجھ سے نہیں لکھا جائے گا۔ چلے جاؤ۔ دیکھو میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

*

مگر یہ منحوس ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ اپنے اکھڑے پیلے پیلے گندے گندے دانت نکالے اپنی بھونڈی ہنسی ہنس رہا ہے۔

تو ایسے نہیں جائے گا، اچھا بھئی اب پھر میں اپنی یادوں کی راکھ کریدتا ہوں۔ شاید اب تیرے لئے مجھے تینتیس روپوں سے نیچے اترنا پڑے گا۔ اور بختیار چپراسی کا آسرا لینا پڑے گا۔ بختیار چپراسی کو پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ اور جب کبھی وہ ڈاکٹر یا کمپونڈر یا کسی نیٹر کے ہمراہ دورے پر جاتا ہے تو اسے ڈبل بھتہ اور سفر خرچ بھی ملتا ہے۔ پھر گاؤں میں اس کی اپنی زمین بھی ہے اور ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے۔ جس کے تین طرف چیل کے بلند و بالا درخت ہیں۔ اور چوتھی طرف ایک خوبصورت سا باغیچہ ہے جو اس کی بیوی نے لگایا ہے۔ اس میں اس نے کڑم کا ساگ بویا ہے اور پالک اور مولیاں اور شلغم اور سبز مرچیں اور آلبیں اور کدو، جو گرمیوں کی دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں۔ اور سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور سبزہ مر جاتا ہے تو کھائے جاتے ہیں۔ بختیار کی بیوی یہ سب کچھ جانتی ہے۔ بختیار کے تین بچے ہیں۔ اس کی بوڑھی ماں ہے جو ہمیشہ اپنی بہو سے جھگڑا کرتی رہتی ہے۔ ایک دفعہ بختیار کی ماں اپنی بہو سے جھگڑا کر کے گھر سے چلی گئی تھی۔ اس روز گہرا ابر آسمان پر چھایا ہوا تھا۔ اور پالے کے مارے دانت بج

رہے تھے، اور گھر سے بختیار کا بڑا لڑکا اماں کے چلے جانے کی خبر لے کر دوڑتا دوڑتا ہسپتال آیا تھا اور بختیار اسی وقت اپنی ماں کو واپس لانے کے لئے کالو بھنگی کو ساتھ لے کر چلدیا تھا۔ وہ دن بھر جنگل میں اسے ڈھونڈتے رہے وہ اور کالو بھنگی اور بختیار کی بیوی جواب اپنے کیے پر پریشان تھی، اپنی ساس کو اونچی آوازیں دے دے کر روتی جاتی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور سردی سے ہات پاؤں شل ہوئے جاتے تھے، اور پاؤں تلے چیل کے خشک جھومر پھیلے جاتے تھے، پھر بارش شروع ہوگئی۔ پھر کرکری پڑنے لگی۔ اور پھر چاروں طرف گہری خاموشی چھاگئی۔ اور جیسے ایک گہری موت نے اپنے دروازے کھول دیئے ہوں۔ اور برف کی پریوں کو قطار۔ اندر قطار باہر زمین پر بھیجدیا ہو۔ برف کے گالے زمین پر گرتے گئے، ساکن، خاموش، بے آواز سپید مخمل، گھاٹیوں، وادیوں، چوٹیوں پر پھیل گئی۔

"اماں" بختیار کی بیوی زور سے چلائی۔

"اماں" بختیار چلایا۔

"اماں" کالو بھنگی نے آواز دی۔

جنگل گونج کے خاموش ہوگیا۔

پھر کالو بھنگی نے کہا "میرا خیال ہے وہ نگر گئی ہوگی تمہارے ماموں کے پاس"

نگر کے دو کوس ادھر انھیں بختیار کی اماں ملی۔ برف گر رہی تھی

اور جب بختیار نے اسے پکڑا تو اس نے ایک لمحے کے لئے مزاحمت کی۔ پھر وہ اس کے بازوؤں میں گر کر بے ہوش ہو گئی اور بختیار کی بیوی نے اسے تھام لیا۔ اور راستے بھر وہ اسے باری باری اٹھاتے چلے آئے بختیار اور کالو بھنگی اور جب وہ لوگ واپس گھر پہنچے تو بالکل اندھیرا ہو چکا تھا اور انھیں واپس آتے دیکھ بچے رونے لگے، اور کالو بھنگی ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا۔ اور اپنا سر کھجانے لگا۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اور وہاں سے چلا آیا۔ ہاں بختیار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں، چھوٹے چھوٹے خوب صورت افسانے اگر کالو بھنگی میں تمہارے متعلق اور کیا لکھ سکتا ہوں۔ میں ہسپتال کے ہر شخص کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھ سکتا ہوں، لیکن تمہارے متعلق اتنا کچھ کر بدنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا کیا جائے، خدا کے لئے اب تو چلے جاؤ۔ بہت ستا لیا تم نے۔

لیکن مجھے معلوم ہے یہ نہیں جائے گا۔ اسی طرح میرے ذہن پر سوار رہے گا۔ اور میرے افسانوں میں اپنی غلیظ جھاڑو لئے کھڑا رہے گا۔ اب میں سمجھتا ہوں تو کیا چاہتا ہے، تو وہ کہانی سننا چاہتا ہے جو ہوئی نہیں لیکن ہو سکتی تھی، میں تیرے پاؤں سے شروع کرتا ہوں۔ سن، تو چاہتا ہے نا کہ کوئی تیرے گندے کھردرے پاؤں دھو ڈالے دھو دھو کر ان سے غلاظت دور کرے ان کی بیاؤں پر مرہم لگائے تو چاہتا ہے، تیرے گھٹنوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں گوشت میں چھپ جائیں، تیری رانوں میں

طاقت اور سختی آجائے، تیرے پیٹ کی مرجھائی ہوئی سلوٹیں غائب ہو
جائیں۔ تیرے کمزور سینے کے گرد غبار سے اٹے ہوئے بال غائب ہوجائیں
تو چاہتا ہے کوئی تیرے ہونٹوں میں رس ڈال دے، انھیں گویائی بخش
دے، تیری آنکھوں میں چمک ڈال دے، تیرے گالوں میں لہو بھر دے،
تیری چندیا کو گھنے بالوں کی زلفیں عطا کرے تجھے ایک مصفا لباس دیدے
تیرے اردگرد ایک چھوٹی سی چار دیواری کھڑی کردے، حسین
مصفا پاکیزہ۔ اس میں تیری بیوی راج کرے تیرے بچے قہقہے لگاتے
پھریں، جو کچھ تو چاہتا ہے، وہ میں نہیں کرسکتا میں تیرے ٹوٹے ہوئے
دانتوں کی روتی ہوئی ہنسی پہچانتا ہوں۔ جب تو تکائے سے اپنا سر
چھواتا ہے مجھے معلوم ہے تو اپنے تخیل میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہے جو تیرے
بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلا رہی ہے۔ حتیٰ کہ تیری آنکھیں
بند ہوجاتی ہیں۔ تیرا سر جھک جاتا ہے اور تو اس کی مہربان آغوش میں سوجاتا
ہے اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لئے مکی کا بھٹا سینکتا ہے اور مجھے
جس محبت اور شفقت سے وہ بھٹا کھلاتا ہے تو اپنے ذہن کی پہنائی میں اس
ننھے بچے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے جو ابھی نہیں آیا۔ جو تیری زندگی
میں کبھی نہیں آئیگا لیکن جس سے تو نے ایک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے۔ تو نے
اسے گودیوں میں کھلایا ہے، اس کا منہ چوما ہے اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر
جہان بھر میں گھمایا ہے۔۔ دیکھ لو، یہ ہے میرا بیٹا، یہ ہے میرا بیٹا اور جب یہ
سب کچھ تجھے نہیں ملا تو تو سب سے الگ ہو کر کھڑا ہوگیا اور حیرت سے اپنا سر
کھجانے لگا، اور تیری انگلیاں لاشعوری انداز میں گننے لگیں، ایک دو تین
چار پانچ چھ سات آٹھ، آٹھ روپے، میں تیری وہ کہانی جانتا ہوں جو

ہو سکتی تھی، لیکن ہو نہ سکی کیونکہ میں افسانہ نگار ہوں، میں ایک نئی کہانی گھڑ سکتا ہوں، اک نیا انسان نہیں گھڑ سکتا۔ اس کے لئے میں اکیلا کافی نہیں ہوں، اس کے لئے افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا، اور ڈاکٹر، اور کمپوزر، اور نجیار، اور گاؤں کے پٹواری اور نمبردار اور دکاندار، اور حاکم اور سیاست داں اور مزدور اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان، ہر شخص کی لاکھوں، کروڑوں، اربوں آدمیوں کی اکٹھی مدد چاہیئے میں اکیلا مجبور ہوں، کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے یہ کام نہ ہوگا اور تو اسی طرح اپنی جھاڑو لئے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا، اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے، اور کوئی معمار عظیم عمارت تعمیر نہ کر سکے گا جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی بلندیاں چھولے کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کی پہنائیوں میں کائنات کی آما قیمت چھلک چھلک جائے۔

یہ بھر پور زندگی ممکن نہیں جب تک تو جھاڑو لئے یہاں کھڑا ہے۔

اچھا ہے کھڑا رہ۔ پھر شاید وہ دن کبھی آجائے کہ کوئی تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا دے، اور تیرے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر تجھے قوس قزح کے اس پار لے جائے!

ایرانی پلاؤ

آج رات اپنی تھی، کیونکہ جیب میں پیسے نہیں تھے۔ جب جیب میں تھوڑے سے پیسے ہوں تو رات مجھے اپنی معلوم نہیں ہوتی۔ اس وقت میرین ڈرائیو پر پھرنے والی گاڑیوں کی معلوم ہوتی ہے، جگمگاتے ہوئے فلیٹوں کی معلوم ہوتی ہے، ایمبیسڈر ہوٹل کی چھت پر ناچنے والوں کی معلوم ہوتی ہے، لیکن آج رات بالکل اپنی تھی آج رات آسمان کے ستارے اپنے تھے، اور بمبئی کی ساری سڑکیں اپنی تھیں جب جیب میں تھوڑے پیسے ہوں تو سارا شہر اپنے اوپر مسلط ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہر شے گھورتی، ڈانٹتی ہے اپنے آپ سے دور بیٹھنے پر مجبور کرتی ہے اونی پتلون سے لیکر خوشنما ریڈیو گرام تک ہر چیز کہتی ہے مجھ سے دور رہو لیکن جب جیب میں ایک پائی نہ ہو اس وقت سارا شہر اپنے لئے بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ہر پتھر پر، گلی کے موڑ پر، بجلی کے ہر کھمبے پر گویا یہ لکھا ہوتا ہے "تعمیر کیا گیا برائے پشن ایک فاقہ مست مصنف۔" اس دن حالات کا ڈر ہوتا ہے نہ گاڑی کے لپیٹ میں آجانے کا، نہ ہوٹل میں کھانے کا، ایک ایسی وسیع بے فکری اور بے کنارہ فاقہ کشی کا نشہ آور موڈ ہوتا ہے، جو میلوں تک پھیلا ہوا چلا جاتا ہے۔ اس رات میں خود

نہیں چلتا ہوں۔ اس رات بمبئی کی سڑکیں مجھے اٹھائے چلتی ہیں، اور گلیوں کے موڑ اور بازاروں کے نکڑ اور بڑی بڑی عمارتوں کے تاریک کونے مجھے خود دعوت دیتے ہیں، اِدھر آؤ ہمیں بھی دیکھو ہم سے ملو، دوست تم آٹھ سال سے اس شہر میں رہتے ہو لیکن پھر بھی اجنبیوں کی طرح کیوں چل رہے ہو۔ اِدھر آؤ ہم سے ہاتھ ملاؤ۔

آج رات اپنی تھی، آج رات کسی کا ڈر نہیں تھا، ڈر اُسے ہوتا ہے جس کی جیب بھاری ہوتی ہے، اس خالی جیبوں والے ملک میں بھاری جیب والوں کو ڈر ہونا ہی چاہیئے لیکن اپنے پاس کیا تھا جسے کوئی چھین سکتا۔

سُنا ہے حکومت نے ایک قانون بنا رکھا ہے، جس کی رو سے رات کے بارہ بجے کے بعد سڑکوں پر گھومنا منع ہے، کیوں کیا بات ہے، رات کے بارہ بجے کے بعد بمبئی میں کیا ہوتا ہے جسے وہ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ میں تو ضرور دیکھوں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے، آج رات تو مجھے کسی کا ڈر نہیں نہ کسی وزیر کا، نہ کسی حوالات والے کا کچھ بھی ہو جائے۔ آج تو میں ضرور گھوموں گا، اور اپنے دوستوں سے ہاتھ ملاؤں گا۔

یہی سوچ کر میں چرچ گیٹ ری کلے میشن کے سامنے کی سڑک سے کود کر یونیورسٹی گراؤنڈ میں گھس گیا۔ ارادہ تو یہ تھا کہ میدان کے بیچ میں سے گزر کر دوسری طرف بڑے تار گھر کے سامنے جا نکلوں گا، اور وہاں سے فلورا فاؤنٹین چلا جاؤں گا۔ مگر میدان سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں چند لڑکے دائرہ بنائے بیٹھے ہیں۔ اور تالی بجا بجا کر گا رہے ہیں۔

تیرا میرا پیار ہوگا۔
تیرا میرا
میرا تیرا
تیرا، میرا، پیار ہوگا۔

دو تین لڑکے تالیاں بجا رہے تھے، ایک لڑکا منہ سے بانسری کی آواز نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک لڑکا سر ہلاتے ہوئے ایک کھوکھلی کے بکس سے طبلے کے بول نکال رہا تھا۔ سب خوشی سے جھوم رہے تھے اور موٹی تپلی اونچی نیچی آوازوں میں گا رہے تھے، میں نے قریب جاکر ان سے پوچھا۔

"کیوں بھئی کس کا کس سے پیار ہوگیا۔"

وہ لوگ گانا بند کرکے ایک لمحہ کے لئے مجھے دیکھنے میں مصروف ہوگئے۔ پتہ نہیں لوگوں کو دیکھنے میں کیسا لگتا ہوں، لیکن اتنا مجھے معلوم ہے کہ ایک لمحہ کے لئے دیکھنے کے بعد لوگ بہت جلد مجھ سے گھل مل جاتے ہیں۔ مجھ سے ایسے مانوس ہو جاتے ہیں کہ زندگی بھر کے راز اور اپنی مقدس کائنات کی ساری تصویریں اور اپنے دل کے سارے دکھ درد مجھ سے کہنے لگ جاتے ہیں۔ میرے چہرے پر کوئی بڑائی نہیں، کوئی خاص اچنبھے کی بات نہیں۔ کوئی رعب اور دبدبہ نہیں، میرے لباس میں بھی کوئی خاص شوکت نہیں وہ طنطنہ نہیں جو کالی اچکن اور سرخ گلاب کے پھول میں ہوتا ہے، یا شارک سکن کے سوٹ میں ہوتا ہے، بس پاؤں میں معمولی چپل ہے، اس کے اوپر لٹھے کا پاجامہ اس کے اوپر لٹھے کی قمیص ہے، جو اکثر بیٹھ پر سے میلی رہتی ہے۔ کیونکہ ایک تو مجھے اپنے جھونپڑے میں زمین پر سونے کی عادت

ہے۔

دوسرے مجھ میں یہ بھی بُری عادت ہے کہ جہاں پر بیٹھتا ہوں اکثر دیوار سے پیٹھ لگا کے بیٹھتا ہوں، یہ الگ بات ہے کہ میری زندگی میں میلی دیواریں زیادہ آتی ہیں، اور اجلی دیواریں بہت کم، قمیص کمبخت کندھوں سے بہت جلد جاتی ہے، اور وہاں اکثر آپ کو ٹانکے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ٹانکے پھٹے ہوئے کپڑے کے دو کناروں کو جوڑنے کا نام ہے، پھٹے پرانے کپڑے کو جوڑنے کی بار بار کوشش کی جاتی ہے، کیونکہ ہر آدمی کالی اچکن پر سُرخ گلاب کا پھول ٹانک نہیں سکتا۔ اس ٹانکنے اور اس ٹانکے میں اس قدر فرق کیوں ہے؟ یہ سچ ہے کہ دو انسان ایک جیسے نہیں ہوتے، ایک شکل و صورت کے نہیں ہوتے، بمبئی میں شب و روز مختلف چہرے دیکھتا ہوں۔ لاکھوں مختلف چہرے لیکن یہ کیا بات ہے کہ ان سب کے کندھوں پر وہی ٹانکے لگے ہوتے ہیں، لاکھوں ٹانکے پھٹی ہوئی زندگیوں کے کناروں کو ملانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں، ایک نقاد نے میرے افسانے پڑھ کر کہا تھا کہ مجھے ان میں کسی انسان کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ یہی مجھ میں مصیبت ہے کہ میں اپنے کرداروں کے چہرے بیان نہیں کرتا، ان کے کندھے کے ٹانکے دیکھتا ہوں۔ ٹانکے مجھے انسان کا اندرونی چہرہ دکھاتے ہیں، اس کی دن رات کی کشمکش اور اس کی شب و روز محنت کا سراغ بتاتے ہیں جس کے بغیر زندگی کا کوئی ناول اور سماج کا کوئی افسانہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس بات کی مجھے خوشی ہے کہ میرا چہرہ دیکھ کر کوئی مجھے کوئی کلرک سمجھتا ہے، کنگھی بیچنے والا یا بال کاٹنے والا، آج تک کسی نے مجھے وزیر یا جیب کاٹنے والا نہیں سمجھا، اس بات کی مجھے خوشی ہے کہ میں ان لاکھوں چھوٹے آدمیوں میں سے ایک ہوں جو بہت جلد ایک

دوسرے سے بغیر کسی رسمی تعارف کے مانوس ہو جاتے ہیں۔

یہاں بھی ایک امتحانی لمحہ کی جھجک کے بعد وہ لوگ میری طرف دیکھ کر مسکرائے، ایک لڑکے نے مجھ سے کہا "آؤ بھئی تم بھی یہاں بیٹھ جاؤ اور اگر گانا چاہتے ہو تو گاؤ۔"

اتنا کہہ کر اس دبلے پتلے لڑکے نے اپنے سر کے بال جھٹک کر پیچھے کر لئے، اور اپنا کنگڑی کے بکس کا طبلہ بجانے لگا۔ ہم سب لوگ پھر گانے لگے۔

تیرا میرا
میرا تیرا
پیار ہو گیا۔

یکایک اسی دبلے پتلے لڑکے نے طبلہ بجانا بند کر دیا اور اپنے ایک ساتھی کو جو اپنی گردن دونوں ٹانگوں میں دبائے اکڑوں بیٹھا تھا۔ ٹہوکا سا دے کر کہا "ابے مدھو بالا تو کیوں نہیں گاتا۔"

مدھو بالا نے اپنا چہرہ ٹانگوں میں سے بڑی دقت سے نکالا اس کا چہرہ مدھو بالا ایکٹریس کی طرح نہیں تھا ٹھوڑی سے لیکر دائیں ہاتھ کی کہنی تک آگ سے جلنے کا ایک بہت بڑا نشان یہاں سے وہاں تک چلا گیا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جو اس کے گول چہرے پر دو کالی کالی درزیں معلوم ہوتیں۔ انتہائی پریشانی جھلک رہی تھی، اس نے اپنے ہونٹ سکیڑ کے طبلے والے سے کہا "سالے مجھے رہنے دے میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔"

"کیوں درد ہوتا ہے! سالے تو نے آج پھر ایرانی پلاؤ کھایا ہوگا۔؟"

مدھو بالا نے بڑے دکھ سے سر ہلایا۔ "ہاں وہی کھایا تھا"

"کیوں کھایا تھا سالے؟"

"کیا کرتا آج صرف تین جوتے بنائے تھے"

ایک اور لڑکے نے جو عمر میں ان سے بڑا تھا، جس کی ٹھوڑی پر تھوڑی داڑھی اُگ آئی تھی، اور کنپٹیوں کے بال رخساروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اپنی ناک کھجاتے ہوئے کہا "ابے مدھو بالا، اٹھ میدان میں دوڑ لگا۔ چل میں تیرے ساتھ دوڑتا ہوں، دو چکر لگانے سے پیٹ کا درد ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نہیں رہنے دے۔"

"نہیں بے سالے اٹھ، نہیں تو تجھا پٹر دوں گا۔"

مدھو بالا نے ہاتھ جوڑ کر کہا "ٹکو رہنے دے میں تیری منت کرتا ہوں۔ یہ پیٹ کا درد ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اٹھ بے۔ کیوں ہماری سنگت خراب کرتا ہے۔"

ٹکو نے ہاتھ بڑھا کر مدھو بالا کو اٹھایا، اور وہ دونوں یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں چکر لگانے لگے، پہلے تو میں تھوڑی دیر تک ان دوڑتے ہوئے لڑکوں کی طرف دیکھتا رہا . . . .

. . . . پھر جب میرے قریب بیٹھے ہوئے لڑکوں نے سر کھجا کے کہا۔ "سالی کیا مصیبت ہے ایرانی پلاؤ کھاؤ تو مصیبت ہے۔ نہ کھاؤ تو مصیبت ہے۔" میں نے کہا "بھائی پلاؤ تو بڑے مزے کی چیز ہے اسے کھانے سے پیٹ میں درد کیسے ہو سکتا ہے؟" میری بات سن کر وہ سب ہنسے، ایک لڑکے نے جس کا نام بعد میں کلدیپ کور معلوم ہوا

اور جو اس وقت ایک پھٹی ہوئی بنڈی، اور ایک پھٹی ہوئی نیکر پہنے تھا، مجھ سے ہنس کر کہنے لگا۔ "معلوم ہوتا ہے تم نے ایرانی پلاؤ کبھی نہیں کھایا۔۔!"

سکلدیپ کور نے اپنی بنڈی کے بٹن کھولتے ہوئے مجھے بتایا کہ ایرانی پلاؤ ان لوگوں کی خاص اصطلاح ہے، اسے یہ لوگ روز روز نہیں کھاتے لیکن جس دن ان لڑکوں کے بہت کم پالش کرتے ہوتے ہیں یا جس دن ان کے پاس بہت کم پیسے ہوتے ہیں اس دن اسے ایرانی پلاؤ کھانا ہی پڑتا ہے۔ اور یہ پلاؤ سامنے کے ایرانی ریستوران سے رات کے بارہ بجے کے بعد ملتا ہے، جب سب گاہک کھانا کھا کے چلے جاتے ہیں، ڈبل روٹی کے ٹکڑے، گوشت اور ہڈیاں چچوڑی ہوئی، چاول کے دانے، آملیٹ کے ریزے، آلوؤں کے قتلے، یہ سارا جھوٹا کھانا ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے۔ اور اس کا ایک ملغوبہ تیار کر لیا جاتا ہے، اور یہ ملغوبہ دو آنے پلیٹ کے حساب سے بکتا ہے، پیچھے کچن کے دروازے پر اسے ایرانی پلاؤ کہا جاتا ہے اسے عام طور پر اس علاقے کے غریب لوگ بھی نہیں کھاتے، پھر بھی ہر روز دو تین سو پلیٹیں بک ہی جاتی ہیں۔ خریداروں میں زیادہ تر بوٹ پالش والے، فرنیچر پھوسنے والے، گاہکوں کیلئے ٹیکسی لانے والے ہوتے ہیں یا آس پاس کی بلڈنگوں کے بیکار نوکر یا زیر تعمیر بلڈنگوں میں کام کرنے والے مزدور بھی ہوتے ہیں۔

میں نے سکلدیپ کور سے پوچھا "تمہارا نام سکلدیپ کور کیوں ہے؟"

سکلدیپ کور نے اپنی بنڈی بالکل اتار دی اور اب وہ بڑے فخر سے لیٹا ہوا اپنا سیاہ پیٹ سہلا رہا تھا وہ میرا سوال سن کر دیر تک گھاس پر

لوٹ پوٹ ہوگیا پھر ہنس چکنے کے بعد اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔ "ذرا میرا بکسا لانا۔"

ساتھی نے کلدیپ کور کا بکسا لا کر دیا۔ کلدیپ کور نے بکسا کھولا۔ اس میں پالش کا سامان تھا۔ پالش کی ڈبیوں پر کلدیپ کور کی تصویریں بنی ہوئی تھی، پھر اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔ "تو بھی اپنا بکسا کھول" اس نے بھی اپنا بکسا کھولا، اس بکس میں پالش کی جتنی بڑی ڈبیاں تھیں ان پر نرگس کی تصویریں تھیں جو رسالوں اور اخباروں سے کاٹ کر لگائی گئی تھیں۔

کلدیپ کور نے کہا۔ "یہ سالا نرگس پالش مارتا ہے۔ وہ ثریا کا۔ ہم میں سے جتنا پالش والا ہے کسی نہ کسی فلم ایکٹریس کی تصویر کاٹ کر اپنے ڈبوں پر لگاتا ہے، اور اس کا پالش مارتا ہے۔"

"کیوں ۔۔؟"

"سالا گاہک ان باتوں سے بہت خوش ہوتا ہے۔ ام اس سے بولتا ہے۔ صاحب کونسا پالش لگاؤں نرگس، ثریا کہ مدھو بالا؟ پھر گاہک جس فلم ایکٹریس کو پسند کرتا ہے، اس کا پالش مانگتا ہے تو ہم اس کو اس لڑکے کے حوالے کر دیتا ہے، جو نرگس کا پالش یا مینا کا پالش یا کسی دوسری فلم ایکٹریس کا پالش مارتا ہے، ہم آٹھ لڑکے ہیں۔ ادھر سامنے چرچ گیٹ پر کسی بس اسٹینڈ کے پیچھے بیٹھتے ہیں، جس کے پاس جس ایکٹرس کا پالش ہے وہی اس کا نام ہے۔ اس سے ہمارا دھندہ بہت اچھا چلتا ہے اور کام کرنے میں مزا آتا ہے۔"

میں نے کہا "تم ادھر بس اسٹینڈ کے نیچے فٹ پاتھ پر ایرانی ریسٹورانٹ

کے سامنے بیٹھتے ہو تو پولیس والا کچھ نہیں کہتا؟"

کلدیپ کور اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ اب سیدھا ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کو ایک انگلی سے دبا کے اسے یکایک ایک جھٹکے سے یوں نچایا جیسے وہ فضا میں اکنی اچھال رہا ہو بولا۔

"وہ سالا کیا کہے گا۔

اسے دیتا ہے۔ اور یہاں اس میدان میں جو سوتا ہے اس کا بھی پیسہ دیتا ہے پیسہ؟" اتنا کہہ کر کلدیپ کور نے پھر انگوٹھے سے ایک خیالی اکنی ہوا میں اچھالی۔ اور فضا میں دیکھنے لگا۔ اور پھر دونوں ہاتھ کھول کر اس نے اس اکنی کو دبوچ لیا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو کھول کر دیکھا۔ مگر دونوں خالی تھے۔ کلدیپ کور بڑی مزے دارگی سے مسکرایا۔ اس نے کچھ نہیں کہا چپ چاپ اوندھا لیٹ گیا۔

نرگس نے مجھ سے پوچھا "تم ادھر دادر میں پالش مارتے ہو نا؟ میں نے تم کو یزداں ہوٹل کے سامنے شاید دیکھا ہے "

میں نے کہا۔

"ہاں مجھ کو بھی ایک طرح کا پالش والا ہی سمجھو"

"ایک طرح سے کیا۔؟" کلدیپ کور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا "سالا سیدھے سیدھے بات کرو نا۔ تم کیا کام کرتا ہے؟"

اس نے مجھے سالا کہا۔ میں بہت خوش ہوا۔ کوئی اور کہتا تو میں اسے ایک جڑ دیتا۔ مگر جب اس لڑکے نے مجھے سالا کہا تو میں بہت خوش ہوا کیونکہ یہاں سالا گالی کا لفظ نہیں تھا برادری کا لفظ تھا۔ ان لوگوں

نے مجھے اپنی برادری میں شامل کر لیا تھا۔ اس لئے میں نے کہا: "بھائی ایک طرح سے میں بھی پالش والا ہوں۔ مگر میں لفظ پالش کرتا ہوں اور کبھی کبھی چیتھڑے اور کبھی کبھی پرانے میلے چیتھڑوں کو کھرچ کے دیکھتا ہوں کہ ان کی بوسیدہ تہوں میں کیا ہے۔"

نرگس اور نمی ایک دم بول اٹھے "تو سالا پھر گڑبڑ گھوٹالا کرتا ہے۔ صاف صاف کیوں نہیں بولتا۔ کیا کام کرتا ہے؟"

میں نے کہا۔

"میرا نام کرشن ہے۔ میں کہانیاں لکھتا ہوں۔ اخباروں میں لکھتا ہوں۔"

"اوہ تو بابو ہے۔"

نمی بولا۔ نمی ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ یہاں دائرے میں جتنے لڑکے تھے۔ ان سب سے چھوٹا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ذہانت کی تیز چمک تھی اور چونکہ وہ اخبار بھی بیچتا تھا۔ اس لئے اسے مجھ میں بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے میرے قریب آکر کہا۔

"کون سے اخباروں میں لکھتے ہو۔ فری پریس، سنٹرل ٹائمز، بلیٹز، کرانیکل۔ میں سب اخبار والوں کو جانتا ہوں۔"

وہ بڑھ کے میرے قریب آگیا۔

میں نے کہا۔

"میں شاہراہ میں لکھتا ہوں۔"

"شاہراہ؟ کون نیوز پیپر ہے؟"

"دہلی سے نکلتا ہے۔"

"دلی کے چھاپے خانے سے - اوہ ؟" نمی کی آنکھیں چہرے پر پھیل گئیں -

" اور ادب لطیف میں لکھتا ہوں " میں نے رعب ڈالنے کے لئے کہا -

کلدیپ کور ہنسنے لگا " کیا کہا - بدبے خلطیف میں لکھتا ہے - سالے یہ تو کسی انگلش فلم ایکٹر الیس کا نام معلوم ہوتا ہے - بدبے خلطیف؟ آہاہا - ایسے ہی تو اپنا نام بدل کے بدبے خلطیف رکھ لے - بڑا اچھا نام ہے معلوم ہوگا - ہاہاہا " جب سب لڑکے ہنس چکے تو میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا -

" بدبے خلطیف - نہیں " ادب لطیف " لاہور سے نکلتا ہے - بہت اچھا پرچہ ہے "

نریش نے بے پرواہی سے سر ہلا کے کہا " ہاں سالے ہوگا - ادب لطیف ہی ہوگا - ہم کو کیا ہم اس کو بیچ کے ادھر پیسہ تھوڑی کماتے ہیں "

کلدیپ کور میری طرف دیکھ کر پھر ہنسنے لگا ہنستے ہنستے کہنے لگا -
" مگر یار دیکھنے میں تو تو بالکل لکھاری معلوم نہیں ہوتا - بالکل ہماری طرح بالشت والا معلوم ہوتا ہے ہاہاہا وہ سب پھر ہنسنے لگے - میں بھی ان کے ساتھ ہنسنے لگا کہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا -

کلدیپ کور ہنستے ہنستے ایک دم سنجیدہ ہوگیا - میری طرف دیکھ کر بولا -

" اور اس - کہانی سے تم کو کیا مل جاتا ہے ؟"
بس تقریباً اتنا ہی جتنا تمہیں ملتا ہے - اکثر کچھ بھی نہیں ملتا - جب

یں لفظوں پر پالش کر چکا ہوں تو اخبار والے شکریہ کہہ کر مفت لے جاتے ہیں۔ اور اپنے رسالے یا اخبار کو چمکا لیتے ہیں "

تو خالی مغز ماری کیوں کرتا ہے۔ ہماری طرح پالش کیوں نہیں کرتا۔ سچ کہتا ہوں تو بھی آجا ہماری برادری میں بس تیری ہی کسر تھی۔ اور تیرا نام ہم بڑے خلیفہ ہی رکھ دیں گے۔ لا ہاتھ —" میں نے کلدیپ کور سے ہاتھ ملایا۔

کلدیپ کور کہنے لگا مگر چار آنے روز پولیس والے کو دینے پڑیں گے۔"

" اور اگر کسی روز چار آنے نہ ہوئے تو؟"

" تو ہم کو معلوم نہیں کسی سے مانگ۔ چوری کر ڈاکہ ڈال مگر سنتری کو چار آنے دینے پڑیں گے۔ اور مہینے میں دو دن حوالات میں رہنا پڑیگا۔"

" ارے وہ کیوں؟"

"یہ ہم نہیں جانتے۔ سنتری کو ہم روز چار آنے دیتے ہیں ہر ایک پالش والا دیتا ہے۔ پھر بھی سنتری ہر مہینے میں دو دفعہ ہم کو پکڑ کے لے جاتا ہے ایسا اس کا قاعدہ ہے۔ وہ بولتا ہے ہم کیا کریں"

میں نے کہا

" اچھا دو دن حوالات میں بھی رہ لیں گے"۔

اور کلدیپ کور نے کہا

"تم کو مہینے میں ایک بار کورٹ میں بھی جانا پڑے گا۔ تمہارا چالان ہوگا۔ کمیٹی کے آدمی کی طرف سے تم کو کورٹ میں بھی جانا پڑے گا۔ دو روپے یا تین روپے۔ وہ بھی تم کو دینا پڑے گا۔"

"وہ کیوں؟ جب میں چار آنے سنتری کو دیتا ہوں۔ پھر ایسا کیوں ہوگا؟"

"ارے یار سنتری کو بھی تو اپنی کارگزاری دکھانی ہے کہ نہیں۔ تو سمجھتا نہیں ہے۔ سالے بدے حلیف۔"

میں نے آنکھ مار کر کلدیپ کور سے کہا۔" سالے سب سمجھتا ہوں۔"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اتنے میں مدھو بالا اور رگھو دونوں میدان کے چکر لگا کر پسینے میں ڈوبے ہوئے واپس آگئے۔

میں نے مدھو بالا سے پوچھا۔

"تمہارا پیٹ کا درد غائب ہوگیا؟"

مدھو بالا بولا "درد تو غائب ہوگیا۔ مگر اب بھوک بڑے زور کی لگی ہے۔"

نرگس نے کہا" اور مجھے بھی۔"

ممی نے سر ہلا کر کہا۔" تو کیا پھر ایرانی پلاؤ آئے گا؟ پھر پیٹ میں درد ہوگا۔ پھر میدان کے چکر اور پھر بھوک؟" کلدیپ کور نے بڑی تلخی سے کہا۔

ممی نے کہا" میں دو پیسے دے سکتا ہوں۔"

میں نے کہا" ایک آنہ میری طرف سے۔"

سب مل کر چار آنے ہوئے۔ ممی کو ایرانی پلاؤ لانے بھیجا گیا کہ سب چھوٹا ہی تھا۔ پھر ایرانی ریستوران کا باورچی اسے پسند بھی کرتا تھا۔ ممکن ہے ممی کو دیکھ کر چار آنے میں دو پلیٹوں کے بجائے تین پلیٹیں یا کم از کم تین پلیٹوں کا مال مل جائے۔

جب نمی چلاگیا تو میں نے پوچھا " کیا تم لوگ ہر روز یہیں سوتے ہو؟"

" مدھوبالا کے سوا اور سب یہیں سوتے ہیں " گکو نے کہا " مدھوبالا اپنے گھر جاتا ہے مگر آج نہیں گیا "

میں نے مدھوبالا سے پوچھا " تمہارا گھر ہے "

" ہاں ۔ سائین میں ایک جھونپڑا ہے ۔ ماں وہاں رہتی ہے "

" اور باپ ؟ "

مدھوبالا نے ہنس کر کہا " باپ ؟ باپ کا مجھے کیا پتہ ؟ ہوگا سالا سامنے والی کسی بلڈنگ کا سیٹھ "

یکایک وہ سب چپ ہو گئے ۔ جیسے کسی نے ان کے چہرے پر چپت مار دی ہو ۔ لڑکے جو بے آسرا تھے ، بے گھر تھے ، بے نام تھے جنھوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ آنے والی محبت کو فلمی گانوں سے بھرنے کی کوشش کی تھی ۔

تیرا میرا پیار ہو گیا ۔ کدھر ہے تیرا پیار ؟ اے میرے باپ اے میری ماں اے میرے بھائی تو کون ہے ؟

تو کون تھا ؟ کس کئے تو مجھے اس دنیا میں لایا اور ان سخت بے رحم عمارتوں کے ٹیکس زدہ فٹ پاتھوں پر دھکے کھانے کے لئے چھوڑ دیا گیا ایک لمحہ کے لئے ان لڑکوں کے فق ، فریادی چہرے کسی نامعلوم ڈر سے خوفزدہ ہو گئے ۔ اور بڑی سختی سے انھوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لئے جیسے کہیں سے انہیں آسرا نہ ملا جیسے اس شہر کی ہر بڑی عمارت ہر فٹ پاتھ پر چلنے والے قدم نے انہیں ٹھکرا دیا ۔ اور انہیں مجبور کر دیا کہ وہ رات کی تاریکی میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیں ۔ مجھے وہ اس وقت ایسے

خوفزدہ اور معصوم معلوم ہو رہے تھے جیسے بھولے بھولے بچے کسی نامعلوم بے کنار جنگل میں کھو جائیں۔ اسی لئے بمبئی کبھی کبھی مجھے ایک شہر نہیں معلوم ہوتا، ایک جنگل معلوم ہوتا ہے، جس میں معاشرے کی بے نام اولاد سڑکوں کی بھول بھلیوں میں اپنا راستہ ٹٹولتی معلوم ہوتی ہے۔ اور جب راستہ نہیں ملتا تو آنکھیں بند کر کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ جاتی ہے۔ پھر میں سوچتا ہوں ایسا نہیں ہے۔

بمبئی ایک جنگل نہیں ہے۔ شہر ہے۔ لوگ کہتے ہیں اس کی ایک میونسپل کارپوریشن ہے۔ اس کی ایک حکومت ہے ایک نظام ہے۔ اس کی گلیاں ہیں، بازار ہیں، دوکانیں ہیں، راستے ہیں اور گھر ہیں۔ اور یہ سب ایک دوسرے سے ایسے جڑے ہوئے ہیں۔ جیسے ایک مہذب اور متمدن شہر میں چیزیں ایک دوسرے سے منسلک ہوتی ہیں۔ یہ سب میں جانتا ہوں۔ اس کے رستے اور گھروں کو پہچانتا ہوں۔ ان کی عزت اور احترام کرتا ہوں۔ لیکن اس عزت اور احترام، اس محبت کے باوجود میں یہ کیوں دیکھتا ہوں کہ اس بمبئی شہر میں کتنی ہی گلیاں ایسی ہیں جن سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ کتنے ہی راستے ایسے ہیں جو کسی منزل کو نہیں جانتے، کتنے ہی بچے ایسے ہیں جن کے لئے کوئی گھر نہیں ہے۔

یکایک اس خاموشی کو کسی نے توڑ دیا۔ وہ بھاگتا ہوا ہمارے سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایرانی پلاؤ کی تین پلیٹیں تھیں۔ ان سے گرم گرم سوندھا سوندھا دھواں اٹھ رہا تھا جب اس نے پلیٹیں لاکر گھاس پر رکھ دیں تو ہم نے دیکھا کہ ممی کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

"کیا ہوا" کلدیپ کور نے پوچھا۔

ممی نے غضب ناک لہجہ میں کہا
"باورچی نے بڑے زور سے یہاں کاٹ کھایا" ممی نے اپنا بایاں رخسار ہماری طرف کردیا۔
ہم نے دیکھا بائیں رخسار پر بہت بڑا نشان تھا۔
سلطیب کور نے باورچی کو گالی دیتے ہوئے کہا
"حرام زادہ" مگر اس کے بعد وہ سب لوگ ایرانی پلاؤ پر ٹوٹ پڑے۔

ختم شد

ہماری مطبوعات

ناقابل فراموش	دیوان سنگھ مفتون	[illegible].00
دھواں	سعادت حسن منٹو	12.00
آتش پارے	,,	10.00
شکاری عورتیں	,,	8.00
افسانے اور ڈرامے	,,	18.00
سرگزشت اسیر	,,	10.00
ایک کروڑ کی بوتل	کرشن چندر	18.00
فلمی قاعدہ	,,	10 00
مٹی کے صنم	,,	8.00
ہم وحشی ہیں	,,	9.00
تیرھواں سورج	امرتا پریتم	18.00
آتش گل	جگر مراد آبادی	10.00
پرتاں	احمد فراز	15.00

مکتبہ شعر و ادب سمن آباد لاہور